دعوتِ دین

اور

اس کا طریق کار

دعوتِ دین

اور

اس کا طریقِ کار

تالیف:

مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

سلسلۂ مطبوعات نمبر ۴

جملہ حقوق محفوظ

جدید ایڈیشن

ناشر: ..... ماجد خاور
مطبع: ..... سعادت آرٹ پریس
اشاعت: ..... فاران فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام: طبع ششم۔ پانچ سو
تاریخ اشاعت: ..... اکتوبر ۱۹۹۷ء۔ جمادی الثانی ۱۴۱۸ھ
ادارہ: ..... فاران فاؤنڈیشن
۱۳۲۔ فیروز پور روڈ اچھرہ
لاہور۔ ۵۴۶۰۰۔ پاکستان
فون: ۷۵۹۵۱۰۰۔ ۰۴۲
ڈسٹری بیوٹرز: ..... دارالنذکیر
رحمان مارکیٹ۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار
لاہور۔ ۷۲۳۱۱۱۹۔ ۰۴۲
قیمت: /۱۰۵ روپے

فہرس

	عرضِ ناشر	۱۱
	دیباچہ	۱۴
باب ۱	مروجہ طریقۂ تبلیغ کی غلطیاں	۱۵
	مروجہ طریقۂ تبلیغ کی علمی غلطیاں	۱۶
	پہلی غلطی	۱۶
	دوسری غلطی	۱۸
	تیسری غلطی	۱۹
	مروجہ طریقۂ تبلیغ کی عملی غلطیاں	۲۱
	پہلی غلطی	۲۱
	دوسری غلطی	۲۳
	تیسری غلطی	۲۵
	چوتھی غلطی	۲۶
	پانچویں غلطی	۲۷
باب ۲	تبلیغ کس لیے	۳۰
	انبیاء کی ضرورت	۳۰

انبیاء کے باب میں قانونِ الٰہی	۳۱
خاتم الانبیاء کی بعثت	۳۲
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دو پہلو	۳۳
دین کی حفاظت کے لیے دو خاص انتظام	۳۴
تبلیغ بحیثیت ایک فریضۂ رسالت کے	۳۶
تبلیغ کے شرائط	۳۷
پہلی شرط	۳۷
دوسری شرط	۳۸
تیسری شرط	۳۹
چوتھی شرط	۴۱
پانچویں شرط	۴۱
چھٹی شرط	۴۲
مسلمانوں کا فرضِ منصبی	۴۲
خلاصۂ بحث	۴۶
باب ۳ انبیائے کرام پہلے کن کو مخاطب کرتے ہیں	۴۸
انبیاء کا خطاب وقت کے لیڈروں سے	۴۹
حضرت مسیح علیہ السلام کا خطاب	۵۰
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب	۵۳
اس طرزِ خطاب کے وجوہ	۵۵
پہلی وجہ	۵۵

دوسری وجہ ۵۶
تیسری وجہ ۵۷
چوتھی وجہ ۵۹
پانچویں وجہ ۶۰
چھٹی وجہ ۶۱
ساتویں وجہ ۶۳
خاتمۂ بحث ۶۴

باب ۴ انبیائے کرام کا طریقۂ خطاب ۶۶
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ ۶۷
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ۶۸
کافر اور مرتکبِ کفر میں فرق ۶۹
اس فرق کی دو وجہیں ۷۰
پہلی وجہ ۷۰
دوسری وجہ ۷۱
موجودہ حالات میں طریقۂ کار ۷۲

باب ۵ دعوتِ دین میں تدریج ۷۵
انبیاء کی دعوت کے مبادی ۷۵
دعوت کی راہ کی ایک مشکل ۷۷
تعلیم میں دو باتوں کا لحاظ ۷۸

ذہنی استعداد ۷۸
جماعتی استطاعت ۸۱
باب ۶ دعوت کے طریقے ۸۵
علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ دعوت کے طریقوں میں ترقی ۸۶
اجتماعی ترقیوں سے استفادہ ۸۹
خلافِ وقار طریقوں سے احتراز ۹۴
مخالفِ مقصد طریقوں سے احتراز ۹۶
قرآن نے کس مجادلہ کی اجازت دی ہے ۹۷
باب ۷ دعوت کی زبان اور داعیانِ حق کا طرزِ کلام ۱۰۳
داعی کے کام کی نوعیت ۱۰۴
داعیانِ حق کے کلام کی خصوصیات ۱۰۵
پہلی خصوصیت ۱۰۶
دوسری خصوصیت ۱۰۸
تیسری خصوصیت ۱۰۹
چوتھی خصوصیت ۱۱۱
پانچویں خصوصیت ۱۱۳
چھٹی خصوصیت ۱۱۴
ساتویں خصوصیت ۱۱۶
باب ۸ انبیائے کرام کا طرزِ استدلال ۱۱۸
استدلال کی عمومیت ۱۱۹
مخاطب کے اندر فکرِ صالح کی تخم ریزی ۱۲۱

منطقی طرزِ استدلال ۱۲۳
غلط مسلمات پر بنیاد رکھنے سے احتراز ۱۲۶
قدرِ مشترک کی تلاش ۱۲۸
الزامی طریقِ استدلال سے احتراز ۱۳۰
باب ۹ مخاطب کی نفسیات کا لحاظ ۱۳۳
نفسیاتِ مخاطب کی رعایت کے دس اصول ۱۳۳
پہلا اصول ۱۳۴
دوسرا اصول ۱۳۵
تیسرا اصول ۱۳۷
چوتھا اصول ۱۳۸
پانچواں اصول ۱۴۰
چھٹا اصول ۱۴۱
ساتواں اصول ۱۴۲
آٹھواں اصول ۱۴۳
نواں اصول ۱۴۷
دسواں اصول ۱۴۸
باب ۱۰ انبیائے کرام کا طریقِ تربیت ۱۵۱
جماعتی تربیت کے پانچ اصول ۱۵۲
پہلا اصول ۱۵۹
دوسرا اصول ۱۶۱
تیسرا اصول ۱۶۴

	چوتھا اصول	۱۹۴
	پانچواں اصول	۱۹۵
باب ۱۱	داعیِ حق کی ذمہ داری	۱۹۷
باب ۱۲	دعوتِ حق کے مخالفین	۱۷۶
	معاندین	۱۷۶
	متربصین	۱۸۵
	مغفلین	۱۸۹
باب ۱۳	دعوتِ حق کے موافقین	۱۹۱
	سابقین اوّلین	۱۹۱
	متبعین باحسان	۱۹۹
	ضعفاء اور منافقین	۲۰۲
باب ۱۴	دعوتِ حق کے مراحل	۲۰۷
	پہلا مرحلہ ـــــ دعوت	۲۰۸
	دوسرا مرحلہ ـــــ ہجرت و ہجرت	۲۲۳
	تیسرا مرحلہ ـــــ جنگ	۲۳۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

'میں اس بات کا آرزومند تھا کہ میری ناچیز تالیفات، بالخصوص تدبر قرآن' کی اشاعت واشاعت کی ذمہ داری کوئی ایسا شخص اٹھائے جو اس فکر کا حامل ہو جو ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ آرزو پوری کر دی۔ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہٗ میرے پرانے رفقا میں سے ہیں وہ نہ صرف میرے فکر سے، بلکہ بحیثیت مجموعی پورے فکرِ فراہی سے بڑی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اب اس فکر کی ترویج و اشاعت کا بیڑا اٹھالیا ہے اور وہ اپنے ادارہ: فاران فاؤنڈیشن کو، اس کے قیام کے دن سے ہی، اسی مقصد کے لیے مختص کیے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی صلاحیتوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اس خدمت کو بحسن وخوبی انجام دے سکیں گے اور خدا نے چاہا تو آئندہ تھوڑے عرصہ میں، ان کے اور ادارۂ تدبر قرآن و حدیث کے تعاون سے وہ قرآنی فکر و فلسفہ بالکل واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گا جو اس عہ، کے تبلیغ کا اصل جواب ہے۔'

حضرت الاستاذ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدظلہ العالی نے جس بے پایاں محبت و اعتماد کا اظہار اپنی محولہ بالا تحریر —— دیباچہ تدبر قرآن —— میں فرمایا

ہے وہ مجھ عاجز کے لیے سرتا سر اعزاز ہے۔ ان کے اور میرے درمیان اصلاً استاد و شاگرد کا رشتہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں قائم ہوا۔ مصنف و ناشر کا رشتہ ان کی نظرِ عنایت سے ۱۹۷۶ء میں استوار ہوا۔ انہوں نے میری تعلیم و تربیت میں آج تک جو کمال رافت فرمائی اور مشفقت انسانی ہے رسمی اسلوبِ بیان میں اس کا اظہار ناممکن ہے۔ ان سے نسبت ہی میرا سرمایۂ حیات ہے۔ ان کے دیے ہوئے پروگرام کی تکمیل ہی میری زندگی کا مشن اور ترجیحِ اوّل ہے۔ انہوں نے جو شرف بخشا اور اپنے جس عظیم اعتماد کا اظہار فرمایا ہے خدائے بزرگ و برتر کے حضور عجز کی ہوں کہ وہ مجھے ان کی امیدوں کا مصداق بنائے اور فکرِ فراہی و اصلاحی کی ترویج و اشاعت کا جو زریں تاج مجھ بے مایہ فقیر کے سر پر سجایا گیا ہے اس کی لاج رکھے۔ وبیدہ التوفیق!

حضرت الاستاذ کا ذوق آشنا ہوتے ہوئے میرے لیے یہ لازم تھا کہ ان کی نگارشات کو ان کے مطلوب پسندیدہ معیار کے مطابق پیش کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے طور پر ان پر کام شروع کر دیا۔ میں نے بیک وقت شاگرد و ناشر، دونوں حیثیتوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ الحمدللہ نظرِ ثانی اور از سرِ نو کتابت کا بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ پیشکش بھی اسی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کے جدید ایڈیشن میں مندرجہ ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے:

۱۔ متن پر نہایت اہتمام سے نظرِ ثانی کی گئی ہے۔

۲۔ قرآن مجید کے تمام حوالے مکمل نقل کیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ تدبرِ قرآن کے مطابق کر دیا گیا ہے۔

۳۔ کتاب میں موجود تمام اقتباسات کو ان کے اصل ماخذوں سے تقابل کر کے درست کر دیا گیا ہے اور حوالے مکمل نقل کر دیے گئے ہیں۔ مزید برآں بعض جگہ اگر صرف ترجمہ دیا گیا تھا تو ان کی اصل عبارتیں بھی دے دی گئی ہیں۔

اس کتاب کے جدید ایڈیشن کی پیشکش کے غیر معمولی اہتمام کی وجہ سے اس کی دستیابی میں کچھ عرصہ تعطل رہا جس کے لیے میں انتہائی معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ اس کے امتیازی محاسن کی روشنی میں اس کے قدر داں مجھے معاف فرما دیں گے۔ اب اس کا موجودہ ایڈیشن ان شاء اللہ ہمیشہ دستیاب رہے گا۔

اس پیشکش میں ہر ممکنہ احتیاط کے باوصف، اپنی کوتاہیوں کے لیے پیشگی معذرت خواہ ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اس کے قارئین بھی اس کام میں حصہ لیں۔ ان کی جانب سے ہماری کوتاہیوں کی نشان دہی اور بہتری کی ہر قابل عمل تجویز خندہ پیشانی اور شکریہ کے ساتھ قبول کی جائے گی اور آئندہ اشاعتوں میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔

اس پیشکش کی صورت میں مجھ بندۂ حقیر و فقیر سے جو خدمت بن پائی یہ سرتاسر اُس کی توفیق اور تائید و نصرت کا کمال ہے۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

والسلام

ماجد خاور

لاہور

۲۴ فروری ۱۹۸۸ء

دیباچہ

اس کتاب میں انبیائے کرام کا طریقۂ تبلیغ میں نے تفصیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانہ میں جس طرح دین کا مفہوم لوگوں کے ذہن میں ادھورا اور ناقص ہے، اسی طرح دین کی تبلیغ کا مفہوم بھی بہت ہی محدود اور غلط ہے۔ میں نے اس کتاب میں دین کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے (جیسا کہ وہ فی الواقع ہے) سامنے رکھا ہے۔ اسی حیثیت سے اس جدوجہد کے تمام تقاضوں اور اس کے تمام مراحل کی تفصیل کی ہے جو اس نظام کو برپا کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے۔ میں نے اس کتاب کے ہر باب کی بنیاد قرآن مجید کے محکم دلائل پر رکھی ہے۔ پھر جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے، صحیح احادیث سے اس کی وضاحت کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے وہ اس کو فہم قرآن میں بھی معین پائیں گے

لاہور | والسلام
جون ۱۹۵۱ء | امین احسن اصلاحی

باب ۱

مروّجہ طریقۂ تبلیغ کی غلطیاں

تبلیغ کا لفظ سنتے ہی قدرتی طور پر آدمی کا ذہن ان تدبیروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ایک مدت سے مسلمانوں میں تبلیغ دین کے لیے رائج و مقبول ہیں۔ ایک زمانۂ دراز کا تعامل جب کسی کام کے لیے کسی طریقۂ کار کو مانوس بنا دیتا ہے تو دلوں پر اس کا ایسا سکہ بیٹھ جایا کرتا ہے کہ لوگ اس سے علیحدہ ہو کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔ وہی طریقہ اس کے انجام دینے کا بالکل قدرتی طریقہ خیال کیا جانے لگتا ہے۔ جو شخص بھی اس کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہی طریقہ اختیار کرتا ہے یہاں تک کہ بسا اوقات آدمی اس سے بچنے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلتا ہے لیکن چلتے چلتے پاؤں آپ سے آپ پھر اسی پٹے ہوئے راستہ پر پڑ جاتے ہیں جس سے بچنے کا ارادہ کر کے وہ گھر سے نکلا تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ پہلے موجودہ طریقۂ تبلیغ کی غلطیاں اختصار سے بیان کر دی جائیں۔

ہمارے نزدیک مروجہ طریقۂ تبلیغ میں علمی اور عملی دونوں قسم کی غلطیاں ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ یہ طریقۂ تبلیغ اپنے فلسفہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور اپنے طریقۂ کار کے پہلو سے بھی غلط ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ تبلیغ اسلام کے نام سے اب تک جتنی جدوجہد بھی کی گئی ہے وہ بیشتر، نہ صرف یہ کہ اصل مقصد کے لحاظ سے لاحاصل رہی ہے، بلکہ بالفعل اس سے اسلام کی دعوت کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ ہم پہلے اس طریقہ کی علمی غلطیوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

مروجہ طریقۂ تبلیغ کی علمی غلطیاں

پہلی غلطی :

پہلی اور سب سے بڑی علمی غلطی جو اب تک اسلام کو پیش کرنے میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ پیش کرنے والوں نے اپنا اور اسلام کا صحیح موقف نہیں سمجھا جس کے سبب سے وہ اس کو اس حیثیت سے پیش کرنے سے قاصر رہے جس حیثیت سے اس کو قرآن نے پیش کیا تھا۔ قرآن نے اس کو اس حیثیت سے پیش کیا تھا کہ ابتدائے آفرینش سے خدا کا دین یہی ہے جب کبھی بھی اور جس قوم میں بھی خدا نے اپنے کسی نبی کو بھیجا ہے اسی دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ قومیں خدا کے بھیجے ہوئے اس دین میں برابر خرابیاں پیدا کرتی رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ذریعہ سے ان خرابیوں کی اصلاح کرتا رہا ہے یہاں تک کہ اس نے اپنے آخری رسول کے ذریعہ سے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کے اس دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں نازل کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے آمیزش اور تبدیل و تحریف کے خطرہ سے محفوظ کر دیا۔ یہ دین قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ کسی خاص قوم کا دین نہیں ہے، بلکہ تمام بنی نوع آدم کا دین اور خدا کے تمام نبیوں کا لایا ہوا دین ہے جو اس کو مانے وہ مسلم ہے۔ جو نہ مانے وہ غیر مسلم ہے۔ یہ نہ تو خدا کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق کرتا، نہ اس کی کسی کتاب کا انکار کرتا، نہ کسی پر اپنی مطلق فضیلت کا مدعی ہے۔ اس کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ یہ تمام نبیوں کی تعلیم کا قابل اعتبار مجموعہ اور ان کی تعلیموں کو مکمل کرنے والا ہے۔ لیکن ہمارے مبلغوں اور مصنفوں نے اس کے بالکل برعکس اس کو مسلمان قوم کے دین اور دنیا کے تمام دوسرے ادیان کے ایک حریف کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے دوسری آسمانی کتابوں کی تعلیموں کا مذاق اڑایا اور بسا اوقات اس جوش میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ ان کی ان تعلیمات کا بھی مذاق اڑایا جن پر ایمان لانے کی سب سے زیادہ

ذمہ داری بحیثیت مسلم اور تمام انبیاء کے مصدق ہونے کے، خود ان پر عائد ہوتی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کا مقابلہ کر کے دوسرے انبیاء کو کمتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ قرآن مجید میں اس طرح کی مطلق ترجیح و تفضیل کی صریح ممانعت ہے اور یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے جو پہلو تھے وہ تعین کے ساتھ واضح کر دیے گئے تھے اور خود حضورؐ نے تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی تھی کہ دوسرے انبیاء کے مقابل میں آپ کے لیے مطلق فضیلت کا دعویٰ نہ کیا جائے۔ لیکن مسلمانوں نے اسلام اور پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اندھی بہری عصبیتِ قومی کے جوش کے ساتھ پیش کیا اور اس غلطی کا ارتکاب صرف عام واعظوں اور مبلغوں نے ہی نہیں کیا، بلکہ ہمارے ان بڑے بڑے مصنفین و مؤلفین نے بھی کیا جن کی کتابیں مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں کے لیے اسلام کے سمجھنے کا واحد ذریعہ تھیں۔ آپ اپنے تمام بڑے بڑے مصنفوں کی وہ کتابیں اٹھا کر دیکھیے جو اسلام پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں دوسرے انبیاء اور ان کی تعلیمات کی نسبت ایسے زہر آلود فقرے آپ کو ملیں گے جن کو پڑھ کر صاف محسوس ہوگا کہ مسلمان بھی اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں جن میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس طرح کی کتابوں کو عزت و احترام کے ہاتھوں لیا اور اس طرح کے واعظوں کی تقریروں کو داد و تحسین کے ساتھ سنیں کیونکہ اس سے ان کے قومی کبر و غرور کو شہ ملتی تھی۔ برعکس اس کے جن لوگوں کی تحریروں اور تقریروں میں یہ چاشنی نہیں تھی وہ نہ تو عوام ہی میں کچھ حسنِ قبول حاصل کر سکے، نہ خواص ہی میں ان کی کچھ وقعت ہوئی۔ اس سے انکار نہیں کہ یہ زہر آلود تبلیغی لٹریچر پیدا کرنے میں بہت کچھ دخل ان لوگوں کو بھی ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف بدزبانیاں کی ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی مسلمانوں ہی کی غلطی ہے کہ انہوں نے شر کا جواب شر سے دے کر فتنہ انگیزیوں

میں اس کے ساتھ تعاون کیا۔ ان غلطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کے دلوں میں کدورت پیدا ہوئی اور انہوں نے اسلام پر اس حیثیت سے کبھی غور نہیں کیا کہ یہ ان کو انہی کی بھلائی ہوئی سچائیوں کو یاد دلانے اور انہی کے نبیوں اور رسولوں کے ورثہ کو ان کی طرف منتقل کرنے آیا ہے، بلکہ اس کو ایک حریف اور رہزن کی طرح نفرت کی نگاہ سے دیکھا جو ان سے ان کے دین و دھرم کو چھین کر ان کے اوپر خود مسلط ہونا چاہتا ہے۔

دوسری غلطی :

اسلام کو پیش کرنے میں دوسری غلطی یہ کی گئی کہ اس کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے نہیں پیش کیا گیا جو زندگی کے سارے انفرادی و اجتماعی اور عملی اور عقائدی مسائل کو ایک وحدت میں پروتا اور سب کو عقل و فطرت کے مطابق حل کرتا ہے، بلکہ سارا زور ہمارے مبلغوں اور مناظروں نے چند ایسے مسائل پر صرف کیا جو عیسائیوں یا ہندوؤں کے ساتھ مذہبی تصادم سے پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً روح اور مادہ کے حدوث و قدم کی بحث، تناسخ کا مسئلہ، الوہیت مسیح اور تثلیث کا جھگڑا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے مسائل سے ہر فرقہ کے تھوڑے سے پیشہ ور مناظروں کو دلچسپی ہوتی ہے جن کی اصلی کامیابی ان کے حل کرنے میں نہیں، بلکہ ان کو زیادہ سے زیادہ الجھانے میں ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنا اپنی قوت و قابلیت کو ضائع کرنا اور اپنے وقت کو برباد کرنا ہے۔ لیکن ہمارے مبلغین نے زیادہ تر اسی طرح کے معرکوں میں زندگیاں بسر کر ڈالیں۔ انہیں اس بات پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی کہ یہ مسائل تو صرف چند مناظرہ بازوں کی دلچسپی کے ہیں جو ان کو حل کرنا نہیں چاہتے، بلکہ الجھانا چاہتے ہیں۔ باقی ساری دنیا کے سامنے تو آج بالکل دوسرے ہی مسائل ہیں جن کے حل کرنے کے لیے دنیا بے چین بھی ہے اور جن کے حل ہونے ہی پر دنیا کی نجات کا انحصار بھی ہے۔ جو مذہب بھی آگے بڑھ کر ان مسائل

کا قابلِ قبول حل پیش کر دے گا وہی ساری دنیا کا مذہب بن سکے گا۔ ایک ایسی دنیا میں جو اپنے ایجاد کیے ہوئے طریقوں کو آزما کر تھک چکی ہو اور زندگی کے تمدنی و اجتماعی مسائل کا کوئی حل نہ پا رہی ہو، اگر اسلام کو محض چند عقائد اور چند رسوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی بدل جاتا۔ لیکن ہمارے اندر سے جو حضرات تبلیغِ اسلام کا مقصد لے کر اٹھے یا جنہوں نے اسلام پر کتابیں لکھیں شاید ان کے سامنے مذہب کا کبھی تصور تھا کہ یہ چند اعتقادیات کا مجموعہ ہے، زندگی کے عملی مسائل سے اس کو کوئی اثباتی تعلق نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح مسیحیت کی لایعنی موشگافیوں سے دنیا کے ذہین طبقہ نے کوئی دلچسپی نہیں لی اسی طرح اسلام کے ان مسائل کی طرف بھی پڑھی لکھی دنیا نے کوئی توجہ نہیں کی اور تبلیغِ اسلام کی یہ ساری ہماہمی، رسمی مذہبیت کے تھوڑے سے پرستاروں کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ اضاعتِ وقت و مال کے سوا اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔

تیسری غلطی :

اس سلسلہ کی تیسری علمی غلطی یہ ہے کہ ہماری زبان میں اب تک اسلام پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو خالص اکیڈمک قسم کی چیزیں ہیں، یا مناظرانہ طرز کی، یا معذرت خواہانہ انداز کی ہیں یا پھر متکلمانہ بحث و استدلال کے رنگ میں ہیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نافع نہیں ہے۔ علمی بحثیں ان لوگوں کے لیے بے شک مفید ہیں جو اسلام کے اس خاص پہلو پر بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہوں جس پہلو سے وہ بحث متعلق ہے لیکن دعوت و تبلیغ کے لیے نہ وہ لکھی ہی جاتی ہیں نہ اس مقصد کے لیے ان کے اندر کوئی صلاحیت اور کشش ہی ہوتی ہے۔ مناظرانہ طرز کی چیزیں اوّلاً تو، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، چند مخصوص قسم کے مسائل پر ہیں جن سے اسلام کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ثانیاً ان کے اندر وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو دونوں کو اسلام

سے قریب کرنے کے بجائے دور کرنے والی ہیں۔ معذرت خواہانہ انداز کی چیزوں سے ہمارا شارہ ان حضرات کی مذہبی تصنیفات کی طرف ہے جو یورپ سے مرعوب تھے جو چیز اہل یورپ کے ہاں ممدوح قرار پائی ان حضرات نے کوشش کی کہ اس کا وجود اسلام میں بھی ثابت کردیں، اگرچہ اسلام اس سے ہزاروں کوس دور ہو۔ اسی طرح جو چیز ان کے ہاں مردود قرار دے دی گئی اس کے انکار کے دلائل ان حضرات نے بھی جمع کرنے شروع کر دیے، اگرچہ وہ چیز اسلام کے ارکان و اصول میں داخل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کمزور اور مضمحل ذہنیت کے لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے نہ تو وہ اسلام کی صحیح ترجمانی ہے اور نہ اس کے اندر وہ وجدانہ اذعان و یقین ہی ہے جو دلوں کو کھینچتا اور دماغوں کو اپیل کرتا ہے۔ متکلمانہ طرز پر جو چیزیں لکھی گئی ہیں وہ ان سب سے زیادہ مایوس کن ہیں۔ متکلمین کا طرز استدلال عقل و فطرت سے بعید تر ہے۔ اس سے کسی مسئلہ کی گرہوں میں اضافہ تو کیا جا سکتا ہے، لیکن کسی گرہ کو کھولا نہیں جا سکتا۔ یہ طرز استدلال صرف کج بحثیوں کے لیے موزوں ہے۔ اس کے اندر نہ تو دل نشینی ہے، نہ کشش ہے، نہ یہ عقل سلیم اور فطرت انسانی سے کوئی موافقت رکھتا ہے۔ اس کو اسلام کے پیش کرنے کا ذریعہ بنانا لوگوں کو اسلام سے متنفر اور بدگمان کرنا ہے۔ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا واحد طریقہ وہی تھا جو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول نے اختیار کیا۔ لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے فلسفہ سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ انہوں نے قرآن کے طرز استدلال کی طرف نہ صرف یہ کہ کوئی توجہ نہیں کی، بلکہ الٹا اس کو مطعون کیا اور حقیر ٹھہرایا۔ یہ غلطی ہمارے پرانے متکلمین نے بھی کی اور اسی غلطی سے مرکب ہمارے نئے متکلمین بھی ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں پر اسلام کی جہت تمام کرنا تو الگ رہا خود پڑھے لکھے وہ مسلمان بھی، جو مسلمان باقی رہنا چاہتے ہیں یا کم از کم اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا چاہتے ہیں، یہ کہنے لگے کہ اسلام بس دل سے مان لینے کی چیز ہے، عقل سے سمجھنے کی چیز نہیں ہے ۔۔ اور جو جری اور بے باک ہیں انہوں نے علانیہ مذاق اڑانا

شروع کر دیا اور نام کے سوا ہر چیز میں وہ اسلام سے بالکل آزاد ہو گئے۔

مروّجہ طریقۂ تبلیغ کی عملی غلطیاں

مروّجہ طریقۂ تبلیغ میں عملی پہلوؤں سے بھی کچھ کم غلطیاں نہیں ہیں۔ ان میں سے بھی بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

پہلی غلطی:

پہلی عملی غلطی مسلمانوں کی شتر گربگی ہے۔ شتر گربگی سے مطلب یہ ہے کہ ایک طرف یہ ایک اصولی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی تعمیر اسلام اور ایمان کے اصولوں پر ہوئی ہے، لیکن دوسری طرف یہ اس طرح کی تمام خصوصیات بھی اپنے اندر جمع کیے ہوئے ہیں جس طرح کی خصوصیات نسل و نسب یا وطن کے اشتراک یا تہذیب و معاشرت کی یکسانی سے پیدا ہونے والی ایک قوم میں پائی جاتی ہوں۔ ایک طرف تو یہ کہتے ہیں کہ مسلمان وہ ہے جو اللہ پر، اس کی کتابوں پر، یوم آخرت پر ایمان لائے اور معیشت و معاشرت اور اخلاق و عمل کے سارے گوشوں میں اللہ اور اس کے رسولوں کے بتائے طریقوں کا پابند ہو؛ دوسری طرف بے شمار ایسے انسان بھی ان کے اندر شامل ہیں جو بجز اس کے کہ کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں اور کسی طرح کا بھی اشتراک ان کے ساتھ نہیں رکھتے — ایک طرف تو یہ مدعی ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے ہادی اور رہنما محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؛ دوسری طرف انہوں نے اپنی قیادت کی باگیں ان لوگوں کے سپرد کر رکھی ہیں جو علم و عمل، دونوں میں رسول اللہ

کی ہدایات سے بے نیاز ہیں۔ ایک طرف تو یہ اخلاق و عمل کا ایک پورا نظام پیش کرتے اور دعوے کرتے ہیں کہ ان سے منحرف ہو کر کوئی شخص مسلمان باقی نہیں رہ سکتا، دوسری طرف بداخلاقی اور بدعملی کی جتنی قسمیں دوسری قوموں کے اندر پائی جاتی ہیں ان سب کے نمونے وہ خود پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی اسلامیت میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی۔ ایک طرف تو یہ اپنی ساری وابستگی ایک نظامِ حق کے ساتھ دکھاتے ہیں اور مدعی ہیں کہ اس سے سرِ مو انحراف جائز نہیں ہے؛ لیکن دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر مصطفےٰ کمال پاشا کی پوری تاریخ کو اسلامی تاریخ بتاتے ہیں جس کا ایک بڑا حصہ اسلام کے نظامِ حق سے کوئی ادنیٰ مناسبت بھی نہیں رکھتا۔ ایک طرف تو یہ مدعی ہیں کہ اسلام خود ایک مکمل نظامِ زندگی ہے اور آج اگر دنیا کی نجات کسی چیز میں ہے تو بس اس نظام کو اختیار کر لینے ہی میں ہے؛ لیکن دوسری طرف حال یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کا طواف کرتے پھر رہے ہیں کہ معلوم کریں کہ انگریزوں کا نظام زیادہ اسلامی ہے یا امریکیوں کا؛

اپنی یہ دورنگی چاہے مسلمان خود محسوس نہ کرتے ہوں، لیکن دوسری قومیں کوئی وجہ نہیں ہے کہ ان کے اس تضاد کو محسوس نہ کریں۔ وہ لازمی طور پر مسلمانوں کے قول و عمل کے اس تضاد کو دیکھ کر حیران ہوتی ہیں اور ان میں سے اگر کسی اللہ کے بندے کو توفیقِ الٰہی سے اسلام کی طرف کشش بھی ہوتی ہے تو یہ دیکھ کر رک جاتا ہے کہ مسلمان تو اسی طرح کی ایک قوم ہے جس طرح کی قوم خود اس کی اپنی ہے؛ پھر ایک قوم کو چھوڑ کر بالکل اسی طرح کی قوم میں داخل ہونے کے کیا معنی۔ ہماری اس دورنگی کے باوجود اگر کوئی نیک دل غیر مسلم اسلام لاتا ہے تو یقین کرنا چاہیے کہ وہ ہماری دعوت کی وجہ سے اسلام نہیں لاتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس پر اس کے دین کی غلطی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا غلط ہونا بھی واضح کر دیتا ہے۔ وہ اسلام کو مسلمانوں سے بالکل الگ کر کے دیکھتا ہے۔ ورنہ ان لوگوں کی تبلیغ سے کوئی شخص کیا متاثر ہو سکتا ہے جن کے بے اصولے پن

کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بزرگ اشاعتِ علمِ دین کے لیے ایک ادارہ قائم کرتے ہیں، اس مقصد کے لیے مسلمانوں سے روپیہ وصول کرکے سود پر چلاتے ہیں، خود ایک ہندو یا عیسائی تبلیغی کالج میں نوکر ہیں اور اپنے صاحب زادے کو کسی آریہ یا مشن کالج میں تعلیم دلا رہے ہیں[1]۔

دوسری غلطی:

دوسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی شاید مسیحی مشنریوں کی دیکھا دیکھی ہمیشہ تبلیغ کے لیے پست حال طبقوں ہی پر نظر رکھی، حالانکہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ تبلیغ میں اوّل خطاب ان طبقات سے ہونا چاہیے جن کے افکار و نظریات کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہو۔ یہی لوگ دراصل کسی قوم کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اگر یہ راہِ راست پر آجائیں تو سارا نظام آپ سے آپ راہِ راست پر آجاتا ہے اور اگر یہ بگڑے ہوئے رہیں تو اوّلاً تو نیچے کے طبقات میں کوئی اصلاح واقع ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ بالکل عارضی ہوتی ہے۔ ان کا منفعل مزاج بہت جلد ان خرابیوں کو پھر قبول کرلیتا ہے جن کا دباؤ اوپر کے مؤثر اور عامل طبقہ کی طرف سے پڑتا ہے۔ اس کی مثال بالکل قلب اور اعضاء و جوارح کی ہے۔ اگر قلب کی اصلاح ہوجائے تو سارا جسم خود بخود تندرست ہوجاتا ہے اور اگر دل میں بیماری موجود ہے تو اعضاء و جوارح پر روغن کی مالش

[1] جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا اس وقت پیشِ نظر مشرقی پنجاب کے ایک خاص بزرگ تھے۔ اب ظاہر آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ خیال ہوا کہ اب اس حصہ کو حذف کر دیا جائے لیکن چونکہ مسلمانوں کی عام حالت یہی ہے اس وجہ سے اس کو رہنے دیا گیا۔ البتہ اب اس کو ایک خاص تلمیح کے بجائے ایک عام تمثیل سمجھیے۔

اور تضاد سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ عیسائی مشنریوں کے سامنے صرف اپنی تعداد بڑھانے کا سوال تھا۔ اس وجہ سے ان کے لیے تو یہ تدبیر مفید ہو سکتی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے صرف اضافۂ تعداد کے خیال سے تبلیغ کرنا جائز نہیں ہے۔ ان کو تو اللہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہِ راست پر لانا اور ان کی زندگیوں کو ہر پہلو سے سنوارنا ہے۔ اس طرح کا سنوارنا اسی وقت ممکن ہے جب پورا ماحول سنورے اور پورے ماحول کا سنورنا صرف اس صورت میں متوقع ہے جب سوسائٹی کا ذہین اور کارفرما طبقہ اصلاح قبول کرے۔ جو لوگ اجتماعیات پر تھوڑی بہت نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہنگامی اور انقلابی تحریکیں تو نیچے سے چل کر اوپر کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتی ہیں، لیکن ٹھوس اصلاحی اور عقلی دعوتیں اسی وقت جڑ پکڑا کرتی ہیں جب اوپر سے نیچے کی طرف اتر انداز ہوں۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے دعوتِ دین کا کوئی کام کیا، خواہ مسلمانوں کے اندر یا ان سے باہر، انہوں نے بالعموم یہ غلطی کی کہ اپنی نظر ہمیشہ پست حال طبقوں ہی پر رکھی اور ان کو کلمہ پڑھا کر یا نماز سکھا کر انہوں نے سمجھا کہ بس اب ان کی اصلاح ہو گئی۔ بے شبہ اس طرح سے بعض جزئی اصلاحیں تو ہو جایا کرتی ہیں، لیکن اس طرح زندگی بحیثیت مجموعی نہ تو تبدیلی قبول کرتی ہے اور نہ کر سکتی ہے۔ جب آب و ہوا بحیثیت مجموعی خراب ہو تو مریضوں کے علاج سے زیادہ اسبابِ مرض کے استیصال کی کوشش کرنی چاہیے۔ ان گندے نالوں کو بھرنا چاہیے جو جراثیم کو پھیلاتے اور ہوا کو خراب کر رہے ہیں۔ اس کے بغیر جو اصلاح ہوگی اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ تو ایک شخص ایسے مقام پر جہاں طاعون یا ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی ہے، لیکن اس کو ٹیکہ لگا دیا جائے۔ یہ ٹیکہ عارضی طور پر ممکن ہے مضر اثرات کا مقابلہ کرنے میں مدد کرے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام نے، جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے معلوم ہوگا، کبھی عام لوگوں کو پہلے خطاب نہیں فرمایا، بلکہ سوسائٹی کے کارفرما عناصر کی ذہنیتوں کو تبدیل

کرنے کی کوشش فرمائی۔ اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

تیسری غلطی :

تیسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے تبلیغ کا ذریعہ صرف الفاظ کو بنایا، حقیقی اسلامی زندگی کا عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ مجرد اسلام کے اصولوں کی خوبی کی وجہ سے تو صرف تھوڑے سے ذہین اور غیر معمولی اخلاقی جرأت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لا سکتے ہیں۔ دنیا کا بڑا حصہ تو اسی وقت ان اصولوں کی سچائی کا اقرار کرے گا جب عملی زندگی کے اندر ان کو ابھرتا اور اچھے نتائج پیدا کرتا ہوا دیکھے گا۔ لیکن ہمارے یہاں عرصے سے تبلیغ اسلام کے نام سے جو جدوجہد کی گئی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ خوش بیان واعظوں، پُرجوش مبلغوں اور انشاپرداز مصنفوں نے دنیا کو اسلامی زندگی کی خیالی فردوس کی سیر کرائی ہے اور لطف یہ کہ ایک طرف یہ حضرات اسلام کی تمدنی و اجتماعی برکات کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے رہے ہیں، دوسری طرف پوری اسلامی سوسائٹی، اپنے اندر تمام مفاسد جاہلیت کو لیے ہوئے ان کے دعاوی کی تکذیب کرتی رہی ہے۔ عمل کی خاموش زبان دعوے کی ناطق زبان سے زیادہ مؤثر ہے۔ اس وجہ سے یہ سارے وعظ فضا میں گم ہو گئے اور دنیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اگر مجرد لفاظی کے بجائے خدا کے کچھ بندوں نے اس بات کی کوشش کی ہوتی کہ جن اصولوں پر وہ ایمان لائے ہیں انہی اصولوں پر ایک سوسائٹی کی تعمیر کریں تو اس کوشش میں ناکام ہو کر بھی وہ دعوتِ اسلام کی اس سے بدرجہا شاندار خدمت انجام دے سکتے جو اپنے وعظوں اور لیکچروں میں کامیاب ہو کر بھی وہ انجام نہ دے سکے۔ اسلام کو ساری دنیا کے لیے خیر و برکت ثابت کرنے کے لیے نہ تنہا یہ چیز کافی ہو سکتی کہ عہدِ ماضی کے کچھ اثر انگیز واقعات لوگوں کو سنا دیے جائیں اور نہ یہ بات کچھ مفید ہے کہ اس کے عقلی

امکانات پر مضامین لکھے جائیں اور تقریریں کی جائیں۔ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے والی جماعت اجتماعی صورت میں ان اصولوں کا مظاہرہ کرے۔ افسوس ہے کہ سب کچھ ہوا مگر یہی بات نہیں ہوئی۔

چوتھی غلطی :

چوتھی عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی تبلیغ دین کے لیے اسی طرح کے بعض اوچھے طریقے اختیار کیے جس طرح کے اوچھے طریقے عیسائی مشنری یا آریے استعمال کرتے رہے ہیں۔ عیسائیوں نے دنیا کے گرے ہوئے طبقات کو جن لالچوں اور ہتھکنڈوں سے عیسائی بنایا انہی طریقوں کو مسلمانوں نے اپنانا چاہا۔ جو ہتھکنڈے اپنے مقصد کے لیے آریے استعمال کرتے رہتے ہیں مسلمان بھی بے تکلف ان کے استعمال کرنے پر اتر آئے۔ مناظروں میں جو زبان درازیاں، جو کج بحثیاں اور جو دھینگا مشتیاں دوسروں نے کیں مسلمانوں نے بھی ان میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہا۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص کسی لالچ میں آکر یا کسی غلط فہمی میں پڑکر آریہ ہوگیا تو آریوں نے اپنی فتح کا ڈنکا بجایا۔ اسی طرح اگر کسی ہندو نے کہیں اسلام کا اظہار کردیا تو مسلمانوں نے اس کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش کی۔ نادان بچوں کو بہکانا اور بھگالے جانا جس طرح دوسروں کے یہاں اشاعت دین کے پروگرام کا ایک اہم جزو تھا اسی طرح مسلمان بھی ان چیزوں کو جائز سمجھنے لگ گئے۔ اگر نفس کے ہیجان کی وجہ سے کوئی ہندو عورت کسی بے قید مسلمان کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی تو اس کو ایک عظیم الشان تبلیغی فتح سمجھا گیا اور اس طرح کی بے حیائی اور آوارگی بھی نصرت دین میں داخل ہوگئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی بداخلاق عورتوں اور بہت سے آوارہ مردوں نے تبدیلِ دین کو ایک پیشہ بنالیا۔ صبح کو وہ اسلام کا اعلان کرکے مسلمانوں کے کندھوں پر سوار ہوتے اور شام کو اپنے آریہ یا عیسائی ہونے کا اعلان کرکے آریوں یا عیسائیوں سے

روپے اینٹھتے۔ جس زمانہ میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں شدھی سنگھٹن کا زور تھا ایک بزرگ نے دلی کی مسلمان رنڈیوں سے بھی اپیل کی تھی کہ وہ اپنے غیر مسلم آشناؤں پر تبلیغ اسلام کیا کریں۔ ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کی نظروں میں اسلام بالکل بے وقعت ہو کے رہ گیا۔ وہ یہ سمجھنے لگ گئے کہ یہ بھی دنیا کا ایک کاروبار اور محض اپنی قوم کی تعداد بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے جس کو عوام فریبی کے لیے مسلمان اللہ کے دین کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ یہ سمجھنے میں وہ بالکل حق بجانب تھے کیونکہ جس مقصد سے اور جن طریقوں سے وہ اپنے دین کو استعمال کر رہے تھے جب اسی مقصد اور انہی طریقوں سے بالکل حرف بحرف مسلمانوں نے بھی اسلام کو استعمال کیا تو آخر ان کے دلوں پر اسلام کی برتری کا سکہ کیسے بیٹھتا؟

پانچویں غلطی :

پانچویں عملی غلطی یہ ہے کہ اس زمانہ میں چاہے کسی اور کام کے لیے مسلمان کسی قابلیت کی ضرورت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر دو کاموں کے لیے وہ سرے سے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھتے؛ ایک امامتِ مسجد، دوسرا تبلیغِ دین۔ ایک وہ زمانہ تھا جب نماز کی امامت یا تو امیرِ اسلام کرتا تھا یا وہ شخص جس کو امیرِ اسلام اس کام پر مقرر کرے یا اب زمانہ یہ ہے کہ جو شخص دنیا کا کوئی کام انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا مسلمان اس کو اپنی مسجدوں کی امامت کے لیے ڈھونڈتے ہیں۔ ایک مبارک زمانہ وہ تھا جب ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو برپا ہی اس لیے کیا ہے کہ خدا کے رسول نے دینِ حق جس احساسِ ذمہ داری، جس سرگرمی اور جس دل سوزی کے ساتھ ان کو پہنچایا ہے، اسی احساسِ ذمہ داری، اسی سرگرمی اور اسی دل سوزی کے ساتھ یہ دوسروں کو پہنچائیں اور اسلامی خلافت اپنے تمام شعبوں اور اپنے تمام اعلیٰ سے اعلیٰ

کارکنوں سمیت صرف اسی فریضۂ رسالت کی ادائیگی کا ایک ذریعہ تھی جو اللہ کے رسول کی طرف سے اس امت کی طرف منتقل ہوا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ پوری اسلامی سوسائٹی تو اپنے تمام ذہین اور کارفرما افراد اور طبقات کے ساتھ ایک جاہلی نظام کی خدمت میں لگی ہوئی ہے، البتہ خدا کے بعض نیک بندوں کو کبھی کبھی یہ خیال بھی ہو جایا کرتا ہے کہ تبلیغ اسلام بھی ایک نیک کام ہے۔ وہ مسلمانوں سے کچھ پیسے اکٹھا کر کے چند تنخواہ دار ملازمین تبلیغ اسلام کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔ ان ملازمین میں سب سے بڑی صفت جو تلاش کی جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے متعلق کچھ الٹی سیدھی معلومات رکھتے ہوں اور مناظرہ اور تقریر کر سکتے ہوں۔ یہی لوگ کچھ تقریر اور مناظرہ کی مشق بہم پہنچا کر اور کچھ اِدھر اُدھر سے اسلام اور دوسرے مذاہب کے متعلق بے ربط معلومات فراہم کر کے کسی انجمن کی طرف سے تبلیغ اسلام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ اسلام سے واقف ہوتے ہیں نہ دوسرے مذاہب کی انہیں کچھ خبر ہوتی اور نہ ان کے اندر اسلامی سیرت ہی کا کوئی پرتو ہوتا ہے۔ بس بڑے سے بڑا وصف جو ان میں ہوتا ہے وہ زبان درازی اور مناظرہ بازی ہے۔ اور جو تبلیغ اسلام محض زبان درازی اور مناظرہ بازی کے بل پر ہوگی اس کا نتیجہ معلوم ہے۔

مروجہ طریقۂ تبلیغ کی ان بعض موٹی موٹی علمی و عملی غلطیوں کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر اس کا اچھی طرح تجزیہ کر کے اس کو دیکھا جائے تو اس کے بہت سے پہلو بھی قابلِ اعتراض نظر آئیں گے۔ لیکن ہم اس سے زیادہ اس بحث کو طویل نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا مقصود ان باتوں کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ آج جس چیز کو ہم تبلیغ کہتے ہیں اس تبلیغ کو اس تبلیغ سے کوئی دور کی نسبت بھی نہیں ہے جو تبلیغ انبیائے کرام نے کی ہے۔ نہ اس تبلیغ کا مقصد ہی وہ ہے جو انبیائے کرام نے اپنے سامنے رکھا تھا اور نہ اس کا طریقۂ کار ہی وہ ہے جو انہوں نے اختیار فرمایا تھا۔ اس کے مقصد اور طریقۂ کار، دونوں چیزوں میں دوسری غیر مسلم جماعتوں کی نقالی سرایت کر گئی ہے۔ اس وجہ سے ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام

نے کس مقصد کے لیے تبلیغ کی، کس طرح تبلیغ کی، اس کے لیے کیا کیا وسائل و ذرائع اور کیا کیا طریقے اختیار فرمائے، ان کو اس کی راہ میں کیا کیا مرحلے پیش آئے اور ہر مرحلہ کے تقاضوں اور اس کی ذمہ داریوں کو انھوں نے کس طرح پورا کیا اور ان کی اس جدوجہد سے دنیا میں کیا کیا برکتیں ظہور میں آئیں۔

تبلیغ کس لیے

انبیاء کی ضرورت :

اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے پہچاننے کی قابلیت اور نیکی کے اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کر دی ہے۔ اس پہلو سے انسان ایک اعلیٰ مخلوق اور ایک بلند فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ اپنی سمجھ سے نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کرکے اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام کا مستحق ہو اور اگر اپنی فطرت کے خلاف خیر کی جگہ شر کا راستہ اختیار کرے تو فاطر کی طرف سے اپنی اس خلاف فطرت روش پر سزا پائے۔ لیکن اگر ایک طرف اس کی فطرت میں یہ پہلو خوبی اور کمال کا ہے تو دوسری طرف بعض اعتبارات میں خلا اور نقص بھی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ دنیا میں انسان کی ہدایت وضلالت کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت پر چھوڑا نہ آخرت میں اس کو جزا و سزا دینے کے لیے اس فطری رہنمائی کو کافی قرار دیا۔ بلکہ فطرت کے مقتضیات اور اس کی مخفی قابلیتوں کو آشکارا کرنے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرنے کے لیے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ معلوم نہیں تھا اس وجہ سے وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہے اس حقیقت کو قرآن مجید کی ان آیتوں میں واضح کیا گیا ہے :

رُسُلاً مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ (النسآء - ۴ : ۱۶۵)	اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے۔
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (المآئدۃ - ۵ : ۱۹)	اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس ہمارا رسول، رسولوں کے ایک وقفے کے بعد تمہارے لیے دین کو واضح کرتا ہوا آگیا ہے۔ مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس کوئی بشارت دینے والا ہوشیار کرنے والا تو آیا ہی نہیں۔ دیکھو ایک بشیر و نذیر تمہارے پاس آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

انبیاء کے باب میں قانونِ الٰہی :

اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے اور محض اس لیے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکارا ہو جائے، کج روی اور گمراہی پر باقی رہنے کے لیے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے، انبیاء کے بارے میں قانونِ الٰہی یہ رہا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثناء انسانوں میں سے آئے، فرشتوں یا جنوں میں سے نہیں آئے۔ تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے تقاضے انسانوں ہی کے ذریعہ سے واضح کیے جائیں اور لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونہ کا کام دے سکتا ہے۔ اسی طرح بعض مستثنیٰ مثالوں کے سوا، ہر قوم کے اندر اللہ تعالیٰ

نے اسی قوم کے اندر سے رسول بھیجے تاکہ قومی اجنبیت لوگوں کے لیے قبولِ حق میں مانع نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قوم کے لوگوں پر اللہ کے رسولوں نے انہی کی زبان میں حق کی تبلیغ کی تاکہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہو سکے اور زبان بھی صاف ستھری، اپاہج پن سے بالکل پاک اور سب کے فہم سے قریب تر اور دل نشیں استعمال کی۔ پھر اللہ کے ان رسولوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ لوگوں کو ایک مرتبہ حق کی طرف پکار دیا ہو، بلکہ اپنی پوری پوری زندگیاں اسی مقصد میں لگا دیں اور جن باتوں کی دوسروں کو دعوت دی ان کو خود بھی کر کے دکھا دیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان کا مظاہرہ کیا۔ یہ سارا اہتمام محض اس غرض کے لیے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ جاننا چاہیے اس کے بتانے میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے اور لوگ قیامت کے دن اپنی شرارتوں اور بدعملیوں کا الزام اللہ سبحانہ و تعالیٰ پر نہ ڈال سکیں۔

خاتم الانبیاء کی بعثت :

جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کر لیے جو ساری دنیا کو ایک داعیٔ حق کی دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کا بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی و اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظامِ عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائلِ اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغامِ ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے اور ان کے ذریعے سے لوگوں کو وہ مکمل نظامِ زندگی عنایت فرمائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظامِ زندگی

ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اپنی روح کے اعتبار سے وہی دین ہے جس کو تمام انبیاء لے کر آئے۔ صرف بعض اعتبارات سے یہ ان سے مختلف ہے پہلے انبیاء نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کی استعداد کے لحاظ سے دی تھی، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد کی تعلیم اس معیارِ فہم کے لحاظ سے دی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو عطا فرمایا ہے۔ دوسرے انبیاء نے جن قوانین کی تعلیم دی ان میں ان کی قوموں کے خاص مزاج اور ان کے خاص خاص امراض کی بھی رعایت تھی۔ لیکن اسلام کے قوانین میں کسی خاص قومی اور جماعتی مزاج و رجحان کے لحاظ کے بجائے صرف مزاجِ انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظامِ زندگی خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان کی قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جو نظامِ زندگی دنیا کو ملا وہ صرف کسی خاص قوم ہی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ بنی نوع انسان کی تمام انفرادی و اجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے دو پہلو:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تمام عالم کی ہدایت و رہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمامِ حجت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا: ایک بعثتِ خاص، دوسری بعثتِ عام۔

آپ کی بعثتِ خاص اہلِ عرب کی طرف تھی اور اہلِ عرب کے ساتھ اسی خاص نسبت کی وجہ سے آپ کو نبیِ امّی یا نبیِ عربی کہا گیا اور آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی زبان بھی عربی ہوئی۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں —— یعنی تبلیغ اور اتمامِ حجت —— آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست انجام دیں۔

آپ کی بعثتِ عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک امت عطا فرمائی اور اس امت کو یہ حکم دیا کہ رسول نے جس دینِ حق کی تبلیغ تم پر کی ہے اس کی تبلیغ اسی طرح تم دوسروں پر کرتے رہنا:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔
(البقرۃ - ۲ : ۱۴۳)	
وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ط	اور میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے کہ میں بھی اس کے ذریعہ سے تم کو ڈراؤں اور وہ بھی جن کو یہ پہنچے۔
(الانعام - ۶ : ۱۹)	

دین کی حفاظت کے لیے دو خاص انتظام:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک پوری امت کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے برپا کیا تاکہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر بولی میں یہ دعوتِ حق قیامت تک بلند ہوتی رہے اور دنیا الگ الگ نبیوں کی بعثت اور الگ الگ زبانوں میں وحی کے اترنے کی ضرورت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو جائے۔ چونکہ آپ کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت ہونے والی نہیں تھی، خلق کی رہنمائی اور اتمامِ حجت کی پوری ذمہ داری ہمیشہ کے لیے آپ کی امت پر ڈال دی گئی تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے دو خاص انتظام فرمائے۔

ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیلی سے محفوظ فرما دیا تاکہ دنیا کو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہے۔

دوسرا یہ کہ اس امت کے اندر، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے، ہمیشہ کے لیے ایک گروہ کو حق پر قائم کر دیا تاکہ جو لوگ حق کے طالب ہوں ان کے لیے ان کا علم و عمل شمعِ راہ کا کام دیتا ہے۔

اس طرح کی ایک جماعت —— اگرچہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو —— اس امت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ فتنوں کا کتنا ہی زور ہو، لیکن یہ صالح جماعت[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کے عمل کو زندہ رکھے گی۔ جب ضلالت کا اثر اس امت کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جائے گا جس طرح دیوانے کتے کے کاٹے ہوئے آدمی کے رگ و ریشہ میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس امت کے ایک عضو کو اس زہر سے محفوظ رکھے گا۔ جب دنیا کا خمیر اتنا بگڑ جائے گا کہ معروف منکر بن جائے گا اور منکر معروف بن جائے گا اور اہلِ بدعت کا اتنا زور ہوگا کہ معروف کے ان داعیوں کی حیثیت دنیا میں اجنبیوں اور بیگانوں کی ہو جائے گی اس

---

[1] یہاں ہمارا اشارہ "لا تزال طائفة من امتی قائمة بأمر الله، لا یضرهم من خذلهم او خالفهم، حتیٰ یاتی امر الله وهم ظاهرون علی الناس" (صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ۵۳) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گا جو کوئی ان کو نقصان پہنچانا چاہے یا بگاڑنا چاہے تو وہ ایسا نہ کر پائے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آن پہنچے اور وہ لوگوں پر غالب رہیں گے) اور اس مفہوم کی ان متعدد روایات کی طرف ہے جو صحاح میں وارد ہیں اور جن کی صحت پر ائمۂ حدیث کا اتفاق ہے۔

وقت بھی یہ لوگ خلق کو معروف کی طرف پکارتے رہیں گے اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کریں گے ہر دور میں اس طرح کی جماعت کو باقی رکھنے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء ہے کہ جس طرح علم وحی کو قرآن کی صورت میں قیامت تک محفوظ کر دیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کے علم و عمل کو اس جماعت کے ذریعے سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے اور خلق کی ہدایت اور رسول کی حجت تمام کرنے کے لیے جو روشنی مطلوب ہے وہ کبھی گل ہونے نہ پائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ لوگ پہاڑی کے چراغ ہوں گے جن سے راہ ڈھونڈنے والے رہنمائی حاصل کریں گے اور زمین کے نمک ہوں گے جن سے کوئی چیز نمکین کی جائے گی۔

تبلیغ بحیثیت ایک فریضۂ رسالت کے :

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہادت علی الناس یا تبلیغ دین محض بطور ایک نیکی اور دینداری کے کام کے مطلوب نہیں ہے اور نہ محض مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے مطلوب ہے، بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کا جو مقصد اس امت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے، یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اس بندے کو ادا کرنا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں داخل ہے۔ یہ ایک فریضۂ رسالت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امت پر ڈالا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی کریں گے تو وہ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے جس کا بار اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ڈالا ہے اور اس کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خیرِ امت کے اس منصب سے محروم کر دے جس پر اس فرض کی ادائیگی ہی کے لیے ان کو سرفراز فرمایا ہے اور ساری دنیا کی گمراہی کا وبال ان کے سر آئے،

کیونکہ آج خلق پر اتمامِ حجت کا ذریعہ یہی ہیں۔ اگر یہ اتمامِ حجت کے فرض کو ادا نہ کریں تو دنیا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہیوں کے لیے یہ عذر کر سکتی ہے کہ تو نے جن کو شہدا علی الناس بنایا تھا اور جن پر ہماری رہنمائی کی ذمہ داری ڈالی تھی انہوں نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں کی، ورنہ ہم ان ضلالتوں میں نہ پڑتے اور مسلمان اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

تبلیغ کے شرائط :

شہادت علی الناس یا تبلیغِ عام کی یہ ذمہ داری صرف اتنے سے ادا نہیں ہو سکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود ہے خواہ وہ شہادت علی الناس کا یہ فرض انجام دے یا نہ دے اور نہ ان الٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہو سکتی ہے جن پر کتاب کے شروع میں ہم تنقید کر کے بتا چکے ہیں کہ ان تدبیروں سے نہ صرف یہ کہ دعوتِ حق کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ الٹا ان سے شدید نقصان پہنچا۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا حکم دیا ہے اور جن شرائط کے ساتھ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم ان بعض شرطوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو اس فرض کی ادائیگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

پہلی شرط :

اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دینِ حق کے شاہد ہیں پہلے صدقِ دل کے ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے پہلے اس پر خود ایمان لاتے تھے، اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ	رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس
اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ	پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی
(البقرۃ - ۲ : ۲۸۵)	اور مومنین ایمان لائے۔

اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوئیں خواہ وہ آباء و اجداد کا دین ہو، خواہ قوم و قبیلہ کی عصبیت ہو، خواہ اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو، سب سے دست بردار ہونے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا اور ان سارے خطرات میں جو اس ایمان کے سبب سے پیش آئے 'اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ' (الاعراف - ۷ : ۱۴۳) (میں پہلا مومن ہوں) اور 'اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ' (الانعام - ۶ : ۱۶۳) (میں پہلا مسلم ہوں) کہتے ہوئے انہوں نے خود چھلانگ لگائی۔ یہ نہیں ہوا کہ خود تو اس سے کنارے پر کھڑے رہے، لیکن دوسروں کو للکارا کہ تمہاری نجات اگر ہے تو بس اس میں چھلانگ لگا دینے میں ہے۔

دوسری شرط :

دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو ظاہر کرنے کے باوجود ظاہر نہیں کرتا تو وہ 'گونگا شیطان' ہے اور قیامت کے دن اس پر حق کو چھپانے کا وہی جرم عائد ہوگا جو یہود پر عائد ہوا :

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ	اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم
لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا	لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی
تَكْتُمُوْنَهٗ ز	طرح ظاہر کرنا اُسے چھپانا مت۔
(آل عمران - ۳ : ۱۸۷)	

اس معاملہ میں مصلحت مبنی جو کچھ بھی ہونی چاہیے وہ دراصل حق کی خاطر ہونی چاہیے کہ اس کا اظہار صحیح طریق پر، صحیح محل میں، صحیح مخاطب کے سامنے ہو، تاکہ دعوتِ حق کا تخم بارآور ہو۔ اگر آدمی حق کو بالکل نظرانداز کر کے مجرّد اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ایک امرِ حق کے اظہار سے جی چراتا ہے یا اس سے غفلت برتتا ہے تو صرف بعض مستثنیٰ حالات ہی میں اس کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کی جان کے لیے کوئی واقعی خطرہ ہو اور اس امر کو محسوس کرتا ہو کہ اس وقت حق کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان بچالے جائے۔ اس طرح کے کسی واقعی خطرہ کے بغیر اگر کوئی شخص اظہارِ حق سے جی چراتا ہے تو یا تو وہ منافق ہے یا کم از کم بے غیرت اور بے حمیت۔

تیسری شرط:

تیسری شرط یہ ہے کہ یہ شہادت صرف قول ہی سے نہ دی جائے، بلکہ عمل سے بھی دی جائے۔ اسلام میں وہ شہادت معتبر نہیں ہے جس کے ساتھ عمل کی تائید و توثیق موجود نہ ہو۔ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور آپ کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی اس شہادت کو تسلیم نہیں کیا، فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں اور اس کے ثبوت میں ان کے اعمال و اقوال کو ان کے سامنے رکھ دیا جن سے صاف اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی اور حق دشمنی نمایاں تھی۔ جو شخص ایک امر کو حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا ہے اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے موافق ہو، ورنہ وہ ان علمائے یہود کے نقشِ قدم کا پیرو ہے جن کو قرآن نے ملامت کی ہے کہ تم دوسروں کو تو خدا کے ساتھ وفاداری کی دعوت دیتے ہو، لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویّہ

اس کی دعوت کے خلاف ہے وہ درحقیقت اپنی دعوت کی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے۔ اور عمل کی دلیل چونکہ قول کی دلیل سے زیادہ قوی ہے اس وجہ سے خود اس کا رویہ اس کے دعویٰ کے خلاف ایسی حجت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لیے کسی اور حجت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمان اگر اللہ کے دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں، اس کی دعوت بھی دیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اس پر عمل بھی کریں؛ ورنہ اس شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس دین سے منحرف رہنا اور زبان سے اس کے حق ہونے کی شہادت دینا خلق کے اوپر اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل ہی لغو حرکت ہے۔ ایسے بے عمل واعظوں کے وعظوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ اگر اپنی مخلوق کو مجرم ٹھہرائے تو یہ بات اس کے عدل کے خلاف ہوگی۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ خود مسلمانوں پر اس دین کی حجت پوری طرح تمام ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اپنے ہی اقراروں پر پکڑے جائیں گے۔

عملی معاملات میں دین سے انحراف کی جو شکلیں قابلِ درگذر ہیں ان کو قرآن نے خود بیان کر دیا ہے اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتا دیا۔ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جذبات یا شہوات کے غلبہ سے آدمی کا کوئی قدم حق کے خلاف اٹھ جائے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً توبہ کرے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حق سے انحراف پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کی تلافی کی تدبیر یہ ہے کہ آدمی اس چیز سے نکلنے کے لیے جدوجہد کرے۔ اگر توبہ اور اصلاح کی جدوجہد کے بجائے آدمی اپنی غلطی ہی کو اوڑھنا بچھونا بنالے اور جس حالتِ اضطرار میں گرفتار ہو گیا ہے اسی کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے تو شہادت علی الناس کے جس منصب پر وہ مامور کیا گیا تھا، باطل پر اس کی اس قناعت نے، اس سے اسے خود بخود ہٹا دیا۔

چوتھی شرط :

چوتھی شرط یہ ہے کہ یہ شہادت ہر قسم کی قومی و گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر دی جائے۔ نہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس حق سے منحرف کر سکے جس کے ہم داعی ہیں اور نہ کسی قوم کی حمایت و محبت کا جذبہ اس سے ہمیں منحرف کر سکے۔ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہمیں جس طرح بے لاگ ہونا چاہیے، اس کی تعلیم قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو! عدل کے علم بردار بنو،
قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ	اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ	ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں
عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ	اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو۔
(المائدۃ - ۵ : ۸)	

اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مقابل میں جس طرح بے لوث ہونا چاہیے، اس کی تعلیم اس طرح دی ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا	اے ایمان والو! حق پر جمے رہو، اللہ
قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ	کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے
وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ	اگرچہ یہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات،
وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ	تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں
(النسآء - ۴ : ۱۳۵)	کے خلاف ہی پڑے۔

پانچویں شرط :

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے جو خدا کی طرف سے اترا ہے، کسی ملامت یا مخالفت کے اندیشہ سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے۔ جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی کے فرائض میں ہے ان کی شہادت افراد اپنی انفرادی زندگیوں میں دیں۔ نماز ہر شخص پڑھے۔ روزہ ہر شخص رکھے۔ زکوٰۃ ہر صاحبِ مال دے۔ حج ہر صاحبِ استطاعت کرے۔ نیکی، دیانت داری، راست بازی اور پاک بازی کی زندگی ہر مسلمان اختیار کرے۔ البتہ جن چیزوں کی شہادت کے لیے اجتماعی زندگی شرط ہے اس کے لیے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں اور جب وہ وجود میں آجائے تو اس کی شہادت دیں۔ مثلاً معاشرت و معیشت کا اجتماعی نظام اور ملک کا سیاسی نظم و نسق افراد کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کو اسلامی ڈھانچہ میں ڈھالنے کے لیے ایک جماعت کی قوت درکار ہے۔ اس وجہ سے اس سلسلہ میں سب سے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے۔ اس جماعت کے قیام کے بعد اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ میں بھی اس حق کی شہادت واجب ہو جائے گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اترا ہے۔ ذیل میں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے دین کی، بغیر کسی کمی بیشی کے، دعوت کی تاکید کی گئی ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ	اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ	رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس
تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ	کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا
وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ	تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔
(المآئدۃ - ۵ : ۶۷)	اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔
اَلَّذِيْنَ يُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ	وہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور
اللّٰهِ وَيَخْشَوْنَهٗ وَلَا يَخْشَوْنَ	اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا

اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ	کسی سے نہیں ڈرتے ۔
(الاحزاب - ۳۳ : ۳۹)	
وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ	اور کافروں اور منافقوں کی بات کا دھیان نہ کرو۔ اور ان کی ایذا رسانیوں کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔
(الاحزاب - ۳۳ : ۴۸)	
فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ	پس تم اسی دین کی دعوت دو اور اس پر جمے رہو، جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے، اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیو۔ اور اعلان کر دو کہ اللہ نے جو کتاب اتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔
(الشوریٰ - ۴۲ : ۱۵)	

چھٹی شرط:

چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو، اللہ کے دین کی شہادت، جان دے کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو، جنھوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لیے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کی چھاؤں میں بھی دی، ان کو شہید کہا گیا ہے اور غور کیجیے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہو سکتا ہے اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر بھی پائے گا، لیکن

جنھوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیا اور اپنے سر دے کر اس حق کی گواہی دی، درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ آدمی اس کی حمایت و نصرت کی راہ میں اپنا سر کٹا دے۔ پس جو ہمت در یہ بازی کھیل گیا اس نے وہ شہادت دے دی جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہ رہا۔

مسلمانوں کا فرضِ منصبی :

یہی فریضۂ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس امت کو 'خیرِ امت' کہا گیا ہے۔ اگر مسلمان اس فرضِ منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں، ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے، نہ کوئی خاص وجہ فضیلت اور نہ پھر اللہ تعالیٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلت کے ساتھ۔ بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں، جو خدا کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں، اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہو گئیں۔ چنانچہ جس آیت میں مسلمانوں کے 'خیرِ امت' ہونے کا ذکر ہے اسی میں ان کی ذمہ داری بھی واضح کر دی گئی ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ	تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے
لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ	حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو
تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ	اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

(آل عمران - ۳ : ۱۱۰)

اسی جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی یہ ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(آل عمران - ۳ : ۱۰۴)

اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت، معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لیے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس امت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں سے باہر بھی انجام دیتا رہا ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا فرض ایک فرضِ کفایہ تھا اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو اس فرض کی ذمہ داری سے عنداللہ بری کر دیتا تھا۔ لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہو گیا تو جس طرح کسی ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان و مال کی ذمہ داری خود ان کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے اور جب تک وہ ازسرِ نو اپنے نظامِ سیاسی کو درست نہ کر لیں ان میں سے ہر شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھاتا ہے اسی طرح نظامِ خلافت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اب یہ فریضۂ شہادت

علی الناس اس امت کے تمام افراد پر منتقل ہوگیا ہے اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لیے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کردیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہوگی۔

خلاصۂ بحث :

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے :

(ا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے تبلیغ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ امت ہر ملک، ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

(ب) اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے، زبان سے کی جائے، عمل سے کی جائے؛ بلا تقسیم و تفریق، پورے دین کی کی جائے؛ بے خوف لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے؛ اور اگر ضرورت داعی ہو تو جان دے کر کی جائے۔

(ج) اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

(د) اس ادارہ کے منتشر ہوجانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری اُمت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی۔

(ھ) اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں : یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم

اس کو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

(د) اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے، بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے اصل محرک درحقیقت اس فرضِ عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطور مطمحِ نظر اس وقت پیشِ نظر رکھنی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نظامِ دعوتِ خیر پھر وجود میں آجائے جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمامِ حجت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم اور سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے کرے۔ اسی کے لیے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہیے، اسی کے لیے کھانا اور پینا چاہیے اور اسی کے لیے مرنا اور جینا چاہیے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشا کے بالکل خلاف ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لیے کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔ یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انہوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصدِ وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو 'امتِ وسط' یا 'خیرِ امت' کے لقب کا مستحق سمجھیں یا اللہ تعالیٰ سے کسی نصرت و حمایت کی امید رکھیں۔

انبیائے کرام پہلے کن کو مخاطب کرتے ہیں

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے پہلے کن لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں اور کس طرح مخاطب کرتے ہیں؟

سوال کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو انبیاء کی بعثت ان کی پوری قوم کی طرف ہوتی ہے، لیکن کیا وہ آغازِ کار ہی میں پوری قوم کو مخاطب کرتے ہیں یا شروع شروع میں ان کا تخاطب قوم کے کسی خاص طبقہ سے ہی ہوتا ہے؟ اگر کسی خاص طبقہ ہی سے ہوتا ہے تو وہ کونسا طبقہ ہے، عامۃ الناس کا یا ان لوگوں کا جو عامۃ الناس کی قیادت و رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں؟

سوال کے دوسرے جزو کا منشا یہ ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر نبی کی قوم شروع شروع میں، اس کی دعوت سے بیگانہ، بلکہ اس کی شدید مخالف رہی ہے پھر کیا انبیاء نے سب کو منکر و کافر فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز "اے کافرو! ایمان لاؤ" سے "اے مشرکو! اللہ کو ایک مانو" سے کیا یا ان کا طرزِ خطاب کچھ اور ہوا؟ یہ دونوں سوال نہایت اہم ہیں۔ ان کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے دعوت کے نقطۂ آغاز کو متعین کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں اور بہتیرے اپنا اور اپنے مخاطبوں کی صحیح پوزیشن سمجھنے میں بھی افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یا تو یہ ہوا کہ ساری دعوت ایک غلط نقطہ سے شروع ہونے کی وجہ سے بے اثر رہ گئی، یا داعی اور مدعو کا صحیح موقف معین

نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کرلی اور اصلاح کے بجائے اس سے بڑے بڑے فسادات اٹھ کھڑے ہوئے۔

انبیاء کا خطاب وقت کے لیڈروں سے :

اس باب میں ہم سوال کے پہلے حصہ کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ اس تاریخ کی روشنی میں جو قرآن نے پیش کی ہے، ہمارے نزدیک، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرات انبیائے علیہم السلام سب سے پہلے قوم کے ارباب اثر کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے ہوئے بیٹھا تھا :

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ	کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے
اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ	ابراہیم سے، اس کے رب کے باب میں
اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ	اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو
(البقرۃ - ۲ : ۲۵۸)	اقتدار بخشا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں :

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ	تم فرعون کے پاس جاؤ، اس نے بہت
طَغٰى ۖ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى	سر اٹھایا ہے۔ اس سے کہو کہ کیا تم میں کچھ
اَنْ تَزَكّٰى ۪ وَ اَهْدِيَكَ	اپنے کو سدھارنے کا جذبہ ہے؟ کیا میں تمہیں
اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى ۚ	تمہارے رب کی راہ دکھاؤں کہ تم اس سے
(النّٰزعٰت - ۷۹ : ۱۷-۱۹)	ڈرنے والے بنو؟

حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہِ اعظم، بخت نصر کو دعوت دی یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح حضرات نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے ارباب اقتدار اور متکبرین کو جھنجھوڑا اور ان کے انکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ (PATRIARCHICAL) حکومت کے اربابِ حل وعقد تھے اور اس کے واسطہ سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کو دعوت دینے کے لیے بھی آپ نے "امتِ وسط" کو جو طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ آپ نے متعدد سلاطینِ عالم کو نامے لکھے اور اسلام کو پہلے ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ "اسلام لاؤ، سلامت رہو گے، ورنہ تمہاری اور تمہارے زیردستوں، دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر آئے گی"۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے ارباب حل وعقد دعوتِ عام کے لیے، اسی طریقہ کی پیروی کریں اور خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طریقہ پر تبلیغِ عام کی وہ ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء علی الناس کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا خطاب:

یہ ایک حقیقت ہے جس سے کوئی شخص، جس نے انبیاء کی تاریخ پڑھی ہو، انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ساتھ ہی اس واقعے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جن کے بام و در پر

آفتاب ہدایت کی کرنیں سب سے پہلے جبینِ حق بیں تقدیر کی نیرنگی سے قبولِ ہدایت میں سب سے پیچھے دبی رہتے ہیں۔ حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ اور مدینہ کے کسان دور دور سے آتے ہیں اور داخلِ اسلام ہوتے چلے جاتے ہیں، لیکن قریش کے لیڈر، ابولہب، ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ اور طائف کے اشراف، جن کے سامنے خدا کا رسول شب و روز دعوتِ حق بلند کرتا ہے، اس برکت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے اگر فیض پاتے بھی ہیں تو وہ غریب عوام جن کی طرف ابھی دعوت کا خطاب براہِ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ ہے جو لوگ ترتیبِ دعوت میں پیچھے ہیں وہ قبولِ دعوت میں آگے ہو جاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ بات پوری ہو کے رہتی ہے کہ "کتنے ہیں جو آگے ہیں، وہ پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے ہیں وہ آگے ہو جائیں گے"۔ لیکن اس واقعہ کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنی دعوت کی ترتیب نہیں بدلتے اور عامۃ الناس کو اس وقت تک براہِ راست مخاطب نہیں کرتے جب تک وقت کے کارفرما عناصر اور لیڈر حضرات اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ان کو مایوس نہ کریں۔ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی بعثت کے بعد برابر علمائے یہود کے جمود پر ضربیں لگاتے رہے، لیکن ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد بھی جب ان کے کبر و غرور اور پندارِ سیاست کی چٹان نہ ٹوٹی تو وہ ان کو چھوڑ کر جھیل کے کنارے ماہی گیروں کے پاس چلے گئے اور ان کو دعوت دی کہ "اے مچھلیوں کے پکڑنے والو! آؤ، میں تمہیں آدمی کا پکڑنے والا بنا دوں" اور اللہ تعالیٰ نے انہی کے اندر سے ان کو ایسے اہلِ ایمان دیئے جو ان کے حواری کہلائے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ	پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے کفر
الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ	کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ
اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ	کون میرا مددگار بنتا ہے، اللہ کی راہ میں؟

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ
وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے
مددگار، اور آپ گواہ رہیے کہ ہم مسلم ہیں

(اٰل عمرٰن - ۳ : ۵۲)

اس آیت میں ان کی اس دعوتِ عام کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اس وقت بلند کی ہے جب وہ وقت کے علما، اور لیڈروں کے قبولِ حق کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں۔ اس وقت انھوں نے اپنی دعوت عزیمت اور عوام کے سامنے پیش کی اور ایسے درد کے ساتھ پیش کی کہ جس دعوت سے یروشلم کے پشتینی دیندار ذرا نہ پسیجے اس نے دریا کے کنارے کے ملاحوں کے دلوں کو موم کر دیا اور بالآخر انھی کے اندر سے دعوتِ حق کے وہ خادم پیدا ہوئے جنھوں نے بڑی بڑی ہمہ گیر آزمائشوں کا مقابلہ کر کے اس کو دنیا میں غالب اور فتح مند کیا۔ سورۂ صف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا
اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ
مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ
اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ
نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ
طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ
وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ
فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝

اے ایمان والو! تم اللہ کے انصار بنو
جیسا کہ عیسیٰ ابنِ مریم نے دعوت دی
حواریوں کو: کون میرا مددگار بنتا ہے
اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب
دیا کہ ہم اللہ کے انصار بنتے ہیں۔ تو
بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان
لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا۔ تو
ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں
کے مقابل میں مدد کی تو وہ غالب ہے۔

(الصف - ۶۱ : ۱۴)

حضرت مسیح علیہ السلام نے ہدایت و ضلالت کے باب میں تقدیر کی اس نیرنگی

پر کر آگے بڑھنے والے پیچھے رہ جائیں اور پیچھے والے آگے نکل جائیں، نہایت مؤثر اور بصیرت افروز تمثیلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن بحث بالکل دوسرے گوشہ میں نکل جائے گی، اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس حقیقت کو ہم سامنے لانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ قبولِ دعوت میں عموماً سبقت عام لوگ ہی کرتے ہیں جو ترتیبِ دعوت میں مؤخر ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جب تک وقت کے ذہین اور کارفرما عناصر سے مایوس نہیں ہو جاتے اس وقت تک عوام ہی کو براہِ راست مخاطب نہیں کرتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطاب :

غور کر کے دیکھیے تو بعینہٖ یہی صورتِ حال آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی نظر آئے گی۔ آپ نے پہلے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق، قریش کو دعوت دی جو سارے عرب کے مذہبی و سیاسی پیشوا تھے، اور ان کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے اللہ کے دین کو پیش کیا۔ جب ان کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا مظاہرہ ہوا تو آپ نے ان کے قبولِ اسلام کے لیے دعائیں بھی کیں۔ ان میں سے بعض بعض کے لیے، جو قوم میں خاص اہمیت رکھتے تھے، آپ نے تعین کے ساتھ نام لے کر بھی دعا فرمائی۔ مثلاً منقول ہے کہ آپ نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ! عمر یا ابو جہل کے اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت دے"۔ ان لوگوں کے قبولِ اسلام کا شوق آپ پر اس قدر غالب تھا کہ اس جوش میں نہ آپ کو اپنے ضروری آرام کا خیال رہتا نہ اپنے مرتبہ اور عظمت کا، بلکہ بسا اوقات یہ انہماک آپ پر اس قدر غالب ہو جاتا کہ ان مسلمانوں کی تربیت کے لیے بھی آپ کے پاس وقت نہ بچتا جو نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو چکے ہوتے اور تربیت کے محتاج ہوتے۔ لیکن ان کی ساری باتوں کے باوجود آپ ایک مدت تک انہی لوگوں کے ساتھ مشغول رہے اور ان کے

ہر قسم کے طعن و طنز، تحقیر و استہزا اور عناد و اختلاف کو برداشت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جب اتمام حجت کا حق ادا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا اور صرف ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو یا تو ایمان لا چکے تھے یا جن سے توقع تھی کہ اگر ان کو کوئی نصیحت کی جائے گی تو چونکہ وہ بیڈری کے مخصوص امراض سے پاک ہیں اس وجہ سے سنیں گے اور مانیں گے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ کر آپ کو متکبرین سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے:

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ ۝ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(الذّٰریٰت - ۵۱: ۵۴-۵۵)

پس ان سے تم اعراض کرو، اب تم پر کوئی الزام نہیں۔ اور یاددہانی کرتے رہو کیونکہ یاددہانی ایمان والوں کو نفع پہنچاتی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا آیا اس کے پاس نابینا اور تمہیں کیا معلوم شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی! جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی ہے تو جو چاہے یاددہانی حاصل کرے۔ لائق تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں

سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝	میں، معزز باوفا کاتبوں کے ہاتھوں میں۔
(عبس - ۸۰: ۱۵-۱۶)	
لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا	ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں
مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا	سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ
تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ	اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر
جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝	غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہل ایمان
(الحجر - ۱۵: ۸۸)	پر جھکائے رکھو۔

اس طرزِ خطاب کے وجوہ :

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا اپنی دعوت میں یہ ترتیب اختیار کرنا محض ایک اتفاقی واقعہ نہیں ہے، بلکہ اس کے کچھ خاص اسباب ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

پہلی وجہ :

اس کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ واضح وجہ تو یہ ہے کہ عوام الناس علم و عمل اور اخلاق و کردار میں ان لوگوں کے تابع ہوا کرتے ہیں جو سوسائٹی میں اثر و اقتدار رکھتے ہوتے ہیں۔ مشہور ہے کہ 'اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ' لوگ اربابِ اقتدار کے دین پر چلتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر اربابِ اقتدار اصلاح قبول کرلیں تو عوام الناس خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں اور اگر یہ بگڑے رہیں تو عوام الناس تو کوئی اصلاح قبول نہیں کرتے اور اگر قبول کر بھی لیتے ہیں تو اس کا اثر بہت جلد اڑ جایا کرتا ہے۔

دوسری وجہ :

دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام امتیاز رکھنے والے طبقات (PRIVILEGED CLASSES) کے خلاف نہ تو کسی سیاسی یا معاشی تعصب میں مبتلا ہوتے ہیں اور نہ گرے ہوئے طبقات کے لیے ان کے دلوں میں کوئی بے جا عصبیت ہوتی ہے کہ وہ طبقاتی جنگ برپا کر کے مقدم الذکر کو پست اور مؤخر الذکر کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ جو مشن دنیا میں لے کر آتے ہیں وہ کسی فساد کو دوسرے فساد سے بدل دینے سے پورا نہیں ہو سکتا، بلکہ پوری سوسائٹی کو خدا پرستی، صلۂ رحمی اور خوفِ آخرت کی اساس پر قائم کرنے سے پورا ہوتا ہے اس وجہ سے عوام ہوں یا خواص، وہ دونوں کو یکساں محبت و ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور دونوں کے لیے یکساں طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی بیماریوں سے پاک ہو کر صحت قبول کریں۔ البتہ اصلاح کی اس جدوجہد میں وہ اونچے طبقات کی اصلاح کو مقدم رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت انہی کی بیماریاں ہوتی ہیں جن کی چھوت سے دوسرے بیمار ہوتے ہیں۔ پس ان کے علاج کی فکر وہ پہلے کرتے ہیں تاکہ ان کے تندرست ہو جانے کے بعد دوسروں کے علاج میں کچھ زیادہ زحمت باقی نہ رہے۔ اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا طریقہ ہے جو اونچے طبقات کے خلاف ایک قسم کا معاشی تعصب یا انتقام کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کو سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکا کر طبقاتی جنگ برپا کرتے ہیں۔ جس کے نتیجے کے طور پر ان کے خیال میں، وہ عوامی ڈکٹیٹر شپ وجود میں آجاتی ہے جو ان کے نزدیک تمام خیر و فلاح کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ اس تمام خون خرابہ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ پرانے سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹر شپ ختم ہوتی ہے اور نئے سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹر شپ

اس کی جگہ لے لیتی ہے اور ظلم و نا انصافی کا اجارہ جو اب تک چند پرانے خاندانوں کو حاصل تھا وہ چند نئے خاندانوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اس انقلاب سے دنیا کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک گروہ کی آتشِ انتقام بجھ جاتی ہے اور ظلم و نا انصافی اور جاہ و اقتدار کی جو خواہشیں وہ اب تک دبائے ہوئے بیٹھا تھا اور جن کو ابھرنے کا کوئی موقعہ نہیں مل رہا تھا، ان کے ابھرنے اور کھل کھیلنے کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ جن کا منتہائے نظر صرف اس قسم کی اصلاح ہو وہ تو بلاشبہ اس عوام بازی سے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں، لیکن انبیاء جس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے آتے ہیں وہ صرف اتنے سے پورا نہیں ہو سکتا کہ زار کو لینن اور سٹالن سے بدل دیا جائے۔ بلکہ وہ بڑے اور چھوٹے ہر ایک کے اندر سے ظلم و نا انصافی کے محرکات ختم کر دینے سے پورا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس قسم کی جلد بازی ان کے مقصد کے بالکل خلاف ہے۔

تیسری وجہ:

تیسری وجہ یہ ہے کہ جو طبقہ قوم میں اونچا ہوتا ہے عموماً ذہنی اعتبار سے وہی برتر ہوتا ہے۔ یہ ذہنی برتری ہی درحقیقت اس کو قیادت کی جگہ دلاتی ہے اس وجہ سے کوئی دعوت جس کا مقصد ایک اہم فکری و عملی انقلاب ہو، ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اگر کسی صحیح فکر کو قبول کر لیں تو اس کی اساس پر کسی بڑے سے بڑے نظام کو چلا سکتے ہیں۔ اس پہلو سے یہ ایک بڑی قیمت رکھتے ہیں اور ان کو ضائع کرنے میں اصلی نقصان خود ان کو نہیں پہنچتا، بلکہ اس سوسائٹی کو پہنچتا ہے جس کے اندر سے اس طبقہ کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اگر عوامی انقلاب برپا کر کے یہ ختم کر دیے جائیں تو پوری سوسائٹی بالکل اس دودھ کی مانند رہ جاتی ہے جس کا مکھن نکال لیا گیا ہو۔ ایسی سوسائٹی جب انقلاب کی رست خیز سے فارغ ہو کر زندگی کی نئی تعمیر کے نقشے بناتی ہے تب اس کو اپنے

دیوالیہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت اسے علانیہ نظر آتا ہے کہ آگے کے کاموں کے لیے جو ذہنی و فکری صلاحیتیں درکار ہیں ان صلاحیتوں سے اس کی فوج بالکل خالی ہو چکی ہے۔ روس کے پہلے انقلاب کے بعد بالکل یہی صورت پیش آئی تھی۔ انقلاب کے خاتمہ پر جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت آئی وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اپنے نظریات پر حکومت کا انتظام کس طرح چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگ اور خون کی ہولی کھیل کر جو اقتدار انہوں نے حاصل کیا وہ اقتدار خود سنبھال نہ سکے بلکہ سنبھالنے کے لیے اس کو انہی لوگوں کے حوالہ کرنا پڑا جن سے وہ چھینا گیا تھا۔ یہ گروہ ہنگامۂ عام سے مرعوب ہو کر ان شئے نظریات کے آگے جھک تو ضرور گیا تھا، لیکن اپنے دل کے اندر ان کے خلاف سخت نفرت و عداوت چھپائے ہوئے تھا۔ اس وجہ سے اس اقتدار کو اس نے بالکل منافقانہ طور پر استعمال کیا اور اس کے ہاتھوں اس پہلے اشتراکی انقلاب کا حشر وہی ہوا جو کسی تحریک کا اس کو منافقانہ طور پر اختیار کرنے والوں کے ہاتھوں ہو سکتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقۂ دعوت اس قسم کی غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ وہ اپنی دعوت سب سے پہلے ذہین طبقہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں سے جو لوگ ذہانت کے ساتھ سیرت کی بلندی بھی رکھتے ہیں وہ جب اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو ان کی تائید سے دعوت کی قوت دو چند ہو جاتی ہے۔ "خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام اذا فقھوا"[1] (جو ان کے اندر جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوں گے بشرطیکہ وہ حق کو سمجھ جائیں) میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اسی طریق دعوت کی برکت تھی کہ اسلام کو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسے لوگ مل گئے۔ جنہوں نے ایک طرف تو اپنی ذہانت

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب ۵۴۔

کی وجہ سے اصل دعوت کی فکری روح کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ وہ بذاتِ خود اصل دعوت کے شارح و مفسر بن گئے اور دوسری طرف اپنے کردار کی بلندی کی وجہ سے اپنے اندر وہ ایسی ہمتِ مردانہ رکھتے تھے کہ اس دعوت کی اساس پر انہوں نے ایک پورا نظامِ اجتماعی مرتب کر کے اس کو چلا دیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ اسلام عملی حیثیت سے یہ کچھ چاہتا ہے۔

چوتھی وجہ :

چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ مادی اعتبار سے بھی برتر ہوتا ہے۔ یہ مادی برتری فی نفسہٖ کوئی بری چیز نہیں ہے کہ اس سے لازماً نفرت ہی کی جائے۔ اس کے اندر برائی کا اگر پہلو ہے تو صرف اس صورت میں ہے جب یہ باطل کی تائید و تقویت کا ذریعہ ہو۔ اگر باطل کے بجائے یہ حق کی تائید و تقویت کا ذریعہ بن جائے تو جس طرح سلیمانؑ کی شوکت اور ذوالقرنین کی سلطنت ایک نعمت و برکت تھی اسی طرح مادی برتری اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے ارباب جاہ کو حق کی دعوت پہنچانے میں جو اس قدر انہماک تھا اس میں جہاں اور پہلو مدِ نظر تھے وہاں خاص طور پر یہ چیز بھی پیشِ نظر تھی کہ اگر یہ لوگ دعوت قبول کریں گے تو جن مادی اسباب و وسائل پر یہ قابض ہیں وہ آپ سے آپ حق کی نصرت و اعانت کے لیے وقف ہو جائیں گے۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوگا کہ باطل کے ہاتھوں میں سے ایک بہت بڑی طاقت چھن جائے گی اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ یہی طاقت باطل کے خلاف لڑنے کے لیے حق کے ہاتھوں میں ایک زبردست تلوار بن جائے گی۔ ہر دعوتِ حق کا آغاز بے سروسامانی ہی کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ اسی طرح آہستہ آہستہ وقت کے مادی وسائل و ذرائع کو فتح اور ایجاد و اختراع کی قابلیتوں اور علوم و فنون کی طاقتوں کو مسخر کرتی ہے اور جب

وقت آتا ہے، ان کو باطل کے خلاف صف آرا کر دیتی ہے۔ اس بات کو جس طرح دنیا کی ہر تحریک کا لیڈر چاہتا ہے اسی طرح حضرات انبیائے کرام علیہم السلام بھی اس کو چاہتے ہیں، لیکن دوسروں میں اور انبیائے کرام میں یہ فرق ہے کہ ان کے یہاں یہ چیز اتنی اہمیت کبھی نہیں حاصل کرتی کہ اس کے آگے خود اصل مقصد غیر اہم ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے جس منزل میں یہ خواہش اپنی اصلی حد سے متجاوز ہونے لگتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو روک دیتا ہے کہ تم کفار کے مال و جاہ کی طرف نظر نہ اٹھاؤ تمہاری دعوت اپنا زاد و راحلہ اور اپنی حفاظت و ترقی کے سر و سامان خود اپنے ساتھ رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارا اور تمہاری دعوت کا خود کفیل ہے :

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا	اور ان کی بعض جماعتوں کو اس شش زندگی
مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ	کی جس رونق سے ہم نے ان کی آزمائش
زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	کے لیے بہرہ مند کر رکھا ہے اس کی
لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ	طرف نگاہ نہ اٹھاؤ اور تمہارے رب کا
خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ وَأْمُرْ أَهْلَكَ	رزق بہتر اور پائدار ہے اور اپنے لوگوں
بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ	کو نماز کا حکم دو اور اس پر جمے رہو۔ ہم تم
لَا نَسْأَلُكَ رِزْقًا ۖ نَّحْنُ	سے رزق کا مطالبہ نہیں کرتے۔ ہم تم کو
نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوَىٰ	رزق دیں گے اور انجام کار کی فیروزمندی
(طٰہٰ - ۲۰ : ۱۳۱ - ۱۳۲)	تقویٰ کے لیے ہے۔

پانچویں وجہ :

پانچویں وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام دنیا میں ایک ایسے نظام حق کو برپا کرنے کے لیے آتے ہیں جس کی بنیاد خدا کی بندگی، ایمانداری، تنقید، بے رو رعایت

احتساب، اجتہاد اور شوریٰ پر مبنی ہو نہ کہ شخصیت پرستی پر۔ اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ سب سے پہلے ان لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جن کی طبیعت میں کم از کم اتنی بلندی ہو کہ وہ اشخاص کے پیچھے چلنے کے بجائے اپنی فکر ورائے کے پیچھے چل سکیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس مقصد کے لیے بے کار ہیں جس کو لے کر حضرات انبیائے کرام علیہم السلام آتے ہیں۔ یہ جوہر رکھنے والے اشخاص یوں تو ہر طبقہ کے اندر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، لیکن جواہرات کی تلاش بہرحال پہلے معدن ہی میں کی جاتی ہے نہ کہ گھورے پر۔ اس وجہ سے اپنے مقصد کے آدمی چھانٹنے کے لیے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام پہلے سوسائٹی کے ذہین طبقہ ہی کو مخاطب کرتے ہیں اور جب تک ان کی طرف سے مایوس نہیں ہو جاتے دوسری طرف نگاہ نہیں اٹھاتے۔ اس کے برعکس جو لوگ اصول و مقاصد کے بجائے اپنی شخصیتوں کی پرستش کرانا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ذہین طبقہ سے کترا کر عوام میں اپنی تحریک چلاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اگر کچھ سیاسی قابلیت و ہمت رکھتے ہیں تو اپنی ڈکٹیٹر شپ قائم کر لیتے ہیں۔ اور اگر سیاسی قابلیت نہیں رکھتے یا قابلیت تو رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے پوری ہمت نہیں رکھتے تو بس ایک عوامی لیڈر بن کے رہ جاتے ہیں اور اگر کچھ مذہبی سوانگ رچانا جانتے ہیں تو پیری مریدی کی ایک گدی قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ذہین طبقہ سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح چور دن کی روشنی سے گھبراتا ہے۔ ان کے سارے کھیل اندھیرے ہی میں کھیلے جا سکتے ہیں اس وجہ سے یہ اندھیرے ہی کو پسند کرتے ہیں۔

چھٹی وجہ:

چھٹی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی سوسائٹی کے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر اس کے عوام سے کوئی تحریک شروع کی جائے تو عوام میں سے جو لوگ اس تحریک کو قبول کر

اندیشوں میں، بلکہ ایک قسم کے احساسِ کمتری کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں اور جب تک سوسائٹی کے اونچے طبقہ کے کچھ لوگ اس تحریک کے ہم نوا نہ بن جائیں اس وقت تک ان کے اندر اس کے لیے وہ شرحِ صدر نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اس کے اثر سے سرشار ہو کر اس کے لیے کوئی بازی کھیل سکیں۔ اس کی نفسیاتی وجہ بالکل کھلی ہوئی یہ ہے کہ وہ اگرچہ خود اس تحریک کے معتقد ہو چکے ہوتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابھی ان لوگوں کو اس تحریک نے مفتوح نہیں کیا ہے جن کی ذہنی و مادی برتری وہ اب تک تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ کبھی تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ قبول نہ کرنے والوں ہی کا قصور ہو سکتا ہے اور کبھی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ممکن ہے کہ تحریک کے فلسفہ ہی میں کوئی ضعف ہو جو اُن کو نظر آ رہا ہو اور ان کو نظر نہ آ رہا ہو۔ یہ تذبذب کی بیماری ان کو تحریک کے لیے بالکل بے کار بنا کر چھوڑ دیتی ہے اور وہ اقرار کر کے بھی گویا انکار کرنے والوں ہی کی صف میں رہتے ہیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقہ اس خامی سے بالکل پاک ہے۔ وہ شروع ہی میں ان لوگوں کے افکار و نظریات پر حملہ کرتے ہیں جن کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہوتا ہے۔ اور کچھ دنوں کی کشمکش کے بعد وہ ایک طرف تو وقت کے اخلاقی، سیاسی اور مابعد الطبیعی فلسفہ کی جڑیں اکھاڑ کے رکھ دیتے ہیں اور دوسری طرف ان لوگوں کو زچ کر دیتے ہیں جو اس غلط فلسفہ پر نظامِ اجتماعی و سیاسی کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ اس دوران میں عوام الناس تقریباً غیر جانبدار رہ کر اس ساری کشمکش کا نہایت غور سے مطالعہ کرتے ہیں اور اندازہ کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں حق کس کی جانب ہے۔ بعض پڑھے ذہین ہوتے ہیں، پہلے مرحلہ میں واضح ہو جاتا ہے کہ حق پیغمبر کے ساتھ ہے اور وہ اس کو قبول بھی کر لیتے ہیں۔ باقی جو زیادہ ذہین نہیں ہوتے، کچھ عرصہ تک تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ کشمکش اس مرحلہ میں پہنچتی ہے جس مرحلہ میں باطل اپنی حمایت اور حق کے ابطال کے لیے اوچھے

ہتھیاروں کے استعمال پر اتر آتا ہے تو ان کے سامنے بھی حق بالکل واضح ہو کر آ جاتا ہے اور وہ بھی اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ عوام الناس کے یہ دونوں گروہ حق کو قبول کرنے میں کچھ آگے پیچھے ہوتے ہیں، لیکن دونوں ہی اس کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتے ہیں اس وجہ سے وہ اس احساس کمتری میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں جس کی وجہ سے سابق الذکر گروہ مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کے دلوں پر سے حق کے مخالفین کا رعب بالکل اٹھ چکا ہوتا ہے۔ یہ دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس اپنے رویہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے ہٹ دھرمی اور ضد کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کی مکاری، خود غرضی اور جعلسازی بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پوری طرح آ جاتی ہے، اس وجہ سے ان کی دیرینہ قیادت اور سابقہ عظمت کا احترام بھی ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔ یہ بصیرت ان کے اندر احساسِ کمتری کے بجائے ایک احساسِ برتری پیدا کر دیتی ہے اور وہ "بڑوں" کی مخالفت سے جھجکنے اور ڈرنے کی جگہ ان کے مقابل میں حق کی حمایت کرتے ہوئے ایک غیر معمولی رفعت کا احساس کرتے ہیں۔ یہ چیز ان کو ذہنی اور اخلاقی پہلو سے اتنا اونچا کر دیتی ہے کہ اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی ہو، اگرچہ ان کی تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہوں، اگرچہ ان کے تیروں پر تکوں کی بھتی چست کی جاتی ہو لیکن بڑے بڑے غرق آہن سورماؤں اور حسب و نسب اور جاہ و جلال رکھنے والے صنادید کے مقابل میں ان کو لا کر ان کے ذریعہ سے بدر کا معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔

ساتویں وجہ :

ساتویں وجہ یہ ہے کہ کسی دعوت کی پائداری کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ذہین اور اونچے طبقہ کے لوگوں میں سے اس کے لیے کارکن ملیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اس دعوت کو پائداری نصیب نہیں ہوتی اور اہل بدعت بہت جلد اس

میں رخنے پیدا کر کے ساری دعوت کو خراب کر ڈالتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اوپر گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء و اعیان میں سے کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی، صرف عوام کے طبقہ سے ان کو کچھ شاگرد ملے۔ ان شاگردوں کے اخلاص، تقویٰ اور ادائے فرض میں شبہ نہیں ہے۔ ان کے بس میں جہاں تک تھا انہوں نے اس دعوت کو فروغ دینے کی پوری کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود پال نے بہت جلد دین مسیحی کو خراب کر ڈالا اور اپنے اس فساد میں اس نے جس چیز سے سب سے زیادہ کام لیا وہ اس کا یہ پروپیگنڈا تھا کہ مسیحؑ کے شاگرد غیر تعلیم یافتہ عوام میں سے تھے، اس وجہ سے وہ مسیحؑ کی تعلیمات کے اسرار و رموز کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ خود چونکہ یونانی فلسفہ اور تصوف کا ماہر تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مسیحؑ کے براہِ راست شاگردوں سے زیادہ ان کی تعلیمات کو سمجھتا ہے اس وجہ سے عوام پر اس کا جادو چل گیا اور اس کا یہ پروپیگنڈا اس قدر مؤثر ہوا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکا اور دین مسیحی نے بہت جلد ایک بالکل ہی مختلف شکل اختیار کر لی۔ اس کے برخلاف چونکہ اسلام کو قبول کرنے والے حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے ذہین لوگ تھے اس وجہ سے اہلِ بدعت اس میں بہ آسانی رخنہ نہ پیدا کر سکے۔ بلکہ جہاں تک اسلام کی اصل دعوت کا تعلق ہے وہ ہزارہا انقلابات اور ہزارہا گمراہوں اور اہلِ بدعت کی فتنہ انگیزیوں کے باوجود آج تک جوں کی توں باقی ہے۔

خاتمۂ بحث :

یہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقِ دعوت ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انہوں نے پہلے ذہین طبقہ کو مخاطب کیا اور یہی طریقہ ان تمام حالات میں نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جب کہ کسی جزوی اصلاح کی جگہ کلی اصلاح کی ضرورت درپیش ہو۔ اگر کسی جگہ اسلام کا نظامِ حق قائم ہو اور اس کے اندر کوئی جزوی خرابی پیدا ہو گئی ہو اور اس

کی اصلاح کرنی ہو تو اس صورت میں بلا شبہ صرف اسی گروہ کو مخاطب کیا جائے گا جو مذکورہ خرابی کا ذمہ دار ہے۔ لیکن جہاں سرے سے اسلامی نظام قائم ہی نہ ہو اور کسی جزوی اصلاح کی جگہ کلی اصلاح کا معاملہ درپیش ہو، وہاں لازم ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے طریق پر دعوتِ عام بلند کی جائے اور اس دعوت میں سب سے پہلے اس ملک کے ذہین اور کارفرما عناصر کو خطاب کیا جائے، عام اس سے کہ وہ مسلمانوں کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا غیر مسلموں سے۔ یہ سوال کے پہلے جزو کا جواب تھا۔ اب ہم سوال کے دوسرے حصہ پر بحث کریں گے۔

انبیائے کرام کا طریقۂ خطاب

یہ ظاہر ہے کہ انبیاء کی بعثت ہوتی ہی اس زمانہ میں ہے جب کہ حق و باطل میں امتیاز وحیٔ الٰہی کے بغیر ناممکن ہو جاتا ہے اور عملاً تمام نظامِ زندگی حق کی جگہ باطل کے قبضہ میں آچکتا ہے۔ ایسے زمانہ میں حق صرف نبی کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے دائرہ سے باہر حق کے کچھ اجزاء تو پائے جا سکتے ہیں، لیکن پورے حق کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگر انبیائے کرام ابتدا ہی میں لوگوں کو اس طرح مخاطب کریں کہ اے کافرو! ایمان لاؤ، اے مشرکو! توحید اختیار کرو، تو صورتِ واقعہ کے اعتبار سے ان کا یوں دعوت دینا بے جا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے دائرے سے باہر جو کچھ ہے وہ صرف کفر و شرک ہی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ وہ لوگوں کو اے انسانو، اے لوگو، اے میری قوم، اے اہلِ کتاب، اے لوگو جو یہودی ہوئے، اے وہ لوگو جو نصرانی ہوئے، اے وہ لوگو جو ایمان لائے۔ وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتے ہیں اور ان کا یہی طرزِ خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک قوم ان کو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے مایوس نہ کر دے کہ ان کے لیے قوم سے علیحدگی اور ہجرت کا وقت آجائے۔ جب قوم اپنی حق دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ جاتی ہے کہ اہلِ حق کا وجود اپنے اندر کسی طرح گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور تائیدِ حق کی بڑی سے بڑی دلیل بھی اس کی ضد

کے آگے بے کار ہو کے رہ جاتی ہے اس وقت انبیاء اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف الفاظ میں ان لوگوں کے لیے کافر و مشرک وغیرہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ :

یوں تو حقیقت ہر نبی کی دعوت میں واضح ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مختلف مدارج پر جس شخص کی نظر ہوگی وہ اس حقیقت کا کسی طرح انکار نہیں کر سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے عہد کے بادشاہ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو ایک کافر و مشرک کی حیثیت سے مخاطب کر رہے ہیں۔ لیکن دعوت و تبلیغ پر ایک مدت گزر گئی اور دلائل و معجزات کی ساری قوت قوم کی ضد کے مقابل میں نہ صرف بے اثر رہی، بلکہ یہ ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کے درپے ہوگئی، اس وقت انہوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا اور ایسے الفاظ میں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے کفر و شرک کے ساتھ رواداری کی جو آخری حد ہو سکتی تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے اور اب نہ صرف یہ کہ وہ ان کے کفر و شرک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں، بلکہ قوم کے ساتھ اس وقت تک کے لیے اپنی نفرت و عداوت کا بھی اعلان کرنا چاہتے ہیں جب تک وہ توحید پر ایمان نہ لائے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	تمہارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیم اور اس
فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ	کے ساتھیوں میں ہے جب کہ انہوں نے
إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا	اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے،
بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ	جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ	بری ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے
وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ	اور تمہارے مابین ہمیشہ کے لیے دشمنی اور
الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ اَبَدًا	بیزاری آشکارا ہوگئی تاآنکہ تم اللہ وحدہٗ
حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ	لاشریک لہ پر ایمان لاؤ۔

(الممتحنة - ۶۰:۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ :

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ قربِ ہجرت سے پہلے کی کسی سورہ میں بھی یہ بات نہیں مل سکتی کہ آپ نے اپنی قوم کو یا اہلِ کتاب کو صریح طور پر کافر و مشرک یا منافق وغیرہ کے الفاظ سے مخاطب کیا ہو۔ بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یا تو 'يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ' کے الفاظ سے ہے یا 'يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ' یا 'يٰقَوْمِ' کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اہلِ کتاب کے لیے 'يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ' کے یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین کے لیے بھی فتح مکہ کے بعد تک وہی عام لفظ 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' کا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو 'اے منافقو' کے الفاظ سے کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ لیکن جب ایک مدت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجت پوری ہوگئی اور نہ ماننے والوں نے نہ صرف یہ کہ مانا نہیں، بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کر لیا، اس وقت آپ نے ہجرت فرمائی اور کفارِ قریش کو صاف صاف 'اے کافرو' کے الفاظ سے مخاطب کیا اور ان سے اور ان کے دین سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔ اسی ہجرت کے موقعہ پر یہ سورہ نازل ہوئی جو قریش سے اعلانِ برأت بلکہ اعلانِ جنگ کی سورہ ہے :

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۙ کہہ دو : اے کافرو! نہ میں پوجوں گا جن

اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۙ وَلَآ	چیزوں کو تم پوجتے ہو اور نہ تم پوجنے
اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۚ	کے جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں
وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۙ	پوجنے والا ہوا جن کو تم نے پوجا اور
وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ	نہ تم پوجنے والے ہوئے جسے میں
اَعْبُدُ ۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ	پوجتا آرہا ہوں۔ تمہیں تمہارا دین اور
دِيْنِ ۔	مجھے میرا دین[1]!

(الکٰفرون - ۱۰۹: ۱-۶)

کافر اور مرتکبِ کفر میں فرق:

انبیائے کرام یہ ساری احتیاط صرف اس حد تک برتتے ہیں جہاں تک لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینے کا معاملہ ہے۔ ان کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کو کفر و شرک قرار دینے میں انبیائے کرام کبھی کوئی رعایت نہیں فرماتے۔ اس چیز میں اگر کسی وجہ سے وہ کوئی رعایت کرنا بھی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہیں دی جاتی اور سخت سے سخت مخالف حالات کے اندر بھی ان کو یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے میں نہ وہ کسی خطرہ کی پروا کریں اور نہ کسی مصلحت کا لحاظ کریں۔ اس کا سبب، العیاذ باللہ، یہ تو ہو نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینا چاہتے ہوں، لیکن محض فتنہ کے اندیشہ یا اس خیال سے کہ لوگ دعوت سے

---

[1] عام طور پر اس سورہ کے آخری الفاظ کو لوگ رواداری کے اعلان پر محمول کرتے ہیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ یہ دراصل اعلانِ برأت اور اعلانِ جنگ ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو امام حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۂ کافرون اور ہماری تفسیر تدبر قرآن، جلد نہم۔

بدک جائیں گے، ایسا کرنے سے احتراز کریں۔ اس طرح کی مصلحت پرستی ان کے ہاں جائز ہوتی تو کفار جس طرح کے سمجھوتہ کی تجویزیں پیش کیا کرتے تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو منظور کرکے سارا جھگڑا ختم کر دے سکتے تھے۔ لیکن معلوم ہے کہ کسی پیغمبر نے بھی دین کے بارہ میں کبھی اس طرح کی مصلحت کا لحاظ نہیں کیا، خواہ اس کی وجہ سے یہ سوال قابلِ غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے معاملہ میں جو لوگ اتنے بے خوف تھے انہوں نے کفر و شرک کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے میں اتنی احتیاط کی اور ان سے برأت اور علیحدگی کے اعلان میں اتنی دیر لگائی!

اس فرق کی دو وجہیں:

ہمارے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام اعمالِ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے باوجود ان کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت میں جو دیر لگاتے ہیں اس کی دو نہایت اہم وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ:

پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں کو جو کچھ سرزنش و ملامت ہے وہ اتمامِ حجت اور تبلیغِ کامل کے بعد ہے۔ اگر اتمامِ حجت اور تبلیغ کے بغیر لوگوں پر گرفت یا ان سے اظہارِ بیزاری جائز ہوتا تو اللہ تعالیٰ انبیاء کو مبعوث ہی نہ فرماتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انبیائے کرام لوگوں کو کافر قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت کرنے سے پہلے ان کو اتنا موقعہ دیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور ان کے انکار کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور وجہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ کام ایک مدت

کی تبلیغ و تعلیم کا محتاج ہے۔ انبیاء کے وقفہ کے زمانہ میں جو تاریکی چھا جایا کرتی ہے وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کے اندر خواص کو بھی راہِ حق سجھائی نہیں دیتی چہ جائیکہ عوام کالانعام۔ اس وجہ سے ہر گروہ تعلیم و تبلیغ کا محتاج ہو جاتا ہے اور چونکہ تمام گمراہیاں باپ دادا کی روایات بن کر دلوں میں رچ بس جاتی ہیں اور ان کے ساتھ کچھ لوگوں کے اغراض بھی وابستہ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مٹانے کے لیے ایک مدت تک جہاد کیا جائے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام پورے صبر و استقلال کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اس جہاد میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ حق اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جن کے باطل کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتے ہیں کوئی اور اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ جب تبلیغ کا حق اس حد تک پورا ہو چکتا ہے تب انبیاء کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ منکرین کے کفر و شرک کا اعلان کر کے ان سے علیحدہ ہو جائیں۔

دوسری وجہ :

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب پوری سوسائٹی کا نظام حق کی جگہ باطل کی بنیاد ہی پر قائم ہو کر چلنے لگ جاتا ہے تو ان لوگوں کے لیے بھی حق کی پیروی ناممکن ہو جاتی ہے جو حق کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے ہر گوشے میں فساد اس طرح گھس جاتا ہے کہ کسی محتاط سے محتاط آدمی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ فساد کے کچھ جراثیم نگلے بغیر سانس لے سکے ـــ ایسی صورت میں اگر اس مجبوری کا لحاظ کیے بغیر انبیائے کرام لوگوں پر کفر و شرک کے فتوے جڑ کر ان سے برأت کا اعلان کر دیتے تو یہ بہتوں پر نہایت شدید ظلم ہوتا۔ اس وجہ سے وہ تکفیر اور اعلانِ برأت سے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ایسا ماحول پیدا ہو کہ اس کے

اندر اہلِ حق اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرسکیں۔ یہ ماحول جب پیدا ہونے لگتا ہے اور زندگی کی وہ راہ کھل جاتی ہے جس پر حق پرست چل سکتے ہیں، اگرچہ یہ ابھی تنگ اور دشوار گزار ہی ہو، تب وقت آتا ہے کہ جو لوگ اس کو چھوڑ کر محض اپنی تن پروری اور جھوٹی نمائشوں کی خاطر باطل کی راہ پر بھاگے ہوئے چلے جارہے ہیں اُن کے کفر کا بھی اعلان کر دیا جائے اور ان سے علیحدگی بھی اختیار کر لی جائے۔

موجودہ حالات میں طریقۂ کار:

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے اس اسوۂ حسنہ سے اگر ہم موجودہ حالات میں رہنمائی حاصل کریں تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں جو حالات ہیں وہ بہت سے اعتبارات سے انبیاء کے وقفہ کے زمانہ سے اشبہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب آج بے کم وکاست ہمارے اندر موجود ہے اس وجہ سے اس وقت دنیا کسی نبی کی ہدایت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اب قیامت تک کسی نبی کی محتاج ہوگی۔ لیکن خلق کی رہنمائی اور مسلمانوں کو حق پر استوار رکھنے کے لیے ہمارا شرعی نظام تقاضا ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے اس وقت دنیا جن خرابیوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہو چکی ہے اس کے لیے وہ ایک بڑی حد تک معذور ہے۔ ہم اس کتاب کے باب ۲ میں اس بات کو وضاحت کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے اب دنیا پر اتمامِ حجت کا فرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ڈالا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی صورت یہ ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام قائم کریں جو ایک طرف دنیا کو نیکی اور بھلائی کے رستہ کی دعوت دے، دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو صراطِ مستقیم پر قائم رکھے۔ خلافت کا نظام قائم نہ رہنے کی وجہ

سے ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی پوری نہیں ہو رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات پوری نہیں ہو رہی ہے، بلکہ عملاً ساری دنیا ایک باطل نظام کی گرفت میں آچکی ہے اور باطل ایسی قوت و شوکت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ حق کے لیے موجودہ نظامِ زندگی میں کوئی جگہ سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ نظامِ تعلیم، نظامِ تمدن، نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست، ہر چیز حق سے منحرف اور باطل کی مددگار ہے۔ یہاں تک کہ اس کے زیرِ سایہ اگر کوئی چھوٹا بڑا کام دین کے نام سے انجام دیا بھی جا رہا ہے تو وہ بھی اس وقت کی فضا کی ناسازگاری کی وجہ سے باطل ہی کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ نیک سے نیک انسان، جو فی الحقیقت نیکی اور سچائی کے راستہ ہی پر چلنا چاہتا ہے، آج چند قدم بھی بغیر مزاحمت کے حق کے راستہ پر نہیں چل سکتا۔ اگر دور والے اسے تھوڑی دیر کے لیے بخش دیتے ہیں تو قریب ہی والے اس سے الجھتے ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ سکے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ 'بدی کی راہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں اور نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں' یہ چیز آج آنکھوں سے مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ باطل کی منزل پر پہنچنے کے لیے فراخ سڑکیں ہیں، دور تک درختوں کا سایہ ہے، تیز رو سواریاں ہیں، حفاظت کے لیے بدرقہ ہے، ہر منزل پر عیش و آرام ہے، آپ جس وقت چاہیں آرام سے منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس حق کی راہ پہلے ہی قدم پر رُندھی ہوئی ہے۔ اگر آپ ہمت کر کے اس مزاحمت کو دور کر لیں تو آگے کی راہ میں ہر قدم پر خطرہ ہے۔ یہاں تک کہ شروع سے لے کر آخر منزل تک خطرہ کے سوا کچھ ہے ہی نہیں اور کسی شخص کے لیے بھی آج یہ ممکن نہیں ہے کہ سر لیے ہوئے اس راہ میں پاؤں رکھنے کی جرأت کر سکے۔ ایسے نازک اور پُرآشوب زمانہ میں یہ بات ذرا تعجب انگیز نہیں ہے کہ لوگ راہ سے بے راہ ہو گئے۔ تعجب انگیز اگر کوئی بات ہو

سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ گمراہی کے اتنے سروسامان مہیا ہونے اور شیطان کے ایسے عالمگیر تسلط کے باوجود، خدا کے کچھ بندوں کو اللہ کا نام یاد رہ گیا۔ یہ بے چارے داد کے مستحق ہیں نہ کہ ملامت کے اور مینہ سے لگا دیے جانے کے لائق ہیں نہ کہ کاٹ پھینکے جانے کے۔ جن لوگوں نے اتنے نامساعد حالات کے اندر اپنی شمع ایمان زندہ رکھی ہے اگر ان کو موافق حالات میسر آتے تو وہ بہتر سے بہتر مسلمان ہوتے۔ اس وجہ سے ان کی غلطیوں اور غیر شعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دے کر ان سے نفرت کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کے صحیح مقتضیات کا شعور بیدار ہو۔

دعوتِ دین میں تدریج

انبیائے کرام علیہم السلام جس طرح لوگوں کو مخاطب کرنے میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ترتیب تبلیغ و دعوت کی ایک بڑی حکمت پر مبنی ہے جو اس ترتیب کو الٹ دینے کی صورت میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، مفقود ہو جاتی ہے، اس طرح جن باتوں کو انبیائے کرام پیش کرتے ہیں ان کو پیش کرنے میں بھی وہ ایک خاص تدریج کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ تدریج بھی دعوتِ دین میں ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف ساری محنت اکارت ہو کے رہ جائے، بلکہ اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ اس سے اشاعتِ دین کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جس طرح ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کر دی ہے کہ تبلیغِ دین کے لیے لوگوں کو مخاطب کرنے میں کیا ترتیب اختیار کی جائے اسی طرح تفصیل کے ساتھ یہ بات بھی بیان کر دیں کہ دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کیا تدریج ملحوظ رکھی جائے۔

انبیاء کی دعوت کے مبادی:

چونکہ انبیاء کی بعثت ہمیشہ ایسے زمانے میں ہوتی ہے جب نظامِ حق بالکل درہم برہم

ہو چکا ہوتا ہے اور ایک جاہلی نظام پوری سوسائٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ اس وجہ سے وہ سب سے پہلے ان مبادی کی دعوت بلند کرتے ہیں جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ مبادی تین ہیں:

۱۔ خدا پر ایمان، کامل توحید کے ساتھ۔

۲۔ رسالت پر ایمان، کامل اطاعت کے ساتھ۔

۳۔ آخرت پر ایمان، کامل تفویض کے ساتھ۔

یہی تین چیزیں ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی جاہلیت کی طرف کھسکنی شروع ہوتی ہے اور جب ان میں پوری طرح فساد سرایت کر جاتا ہے تو پوری سوسائٹی پر جاہلیت کی ظلمت چھا جاتی ہے اور انہی تینوں چیزوں کے آشکارا ہونے سے سوسائٹی اسلام کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہے اور جب یہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے تو سوسائٹی پورے دن کی روشنی میں آجاتی ہے۔ ان تینوں چیزوں کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندر اتنا راسخ ہے کہ دنیا میں ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ شیطان کو اچھی طرح علم ہے کہ انہی چیزوں پر نظامِ حق کی بنیادیں قائم ہیں اس وجہ سے اس کی ساری کوشش ہمیشہ اس بات کے لیے رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان میں کوئی نہ کوئی رخنہ ضرور پیدا کرے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے اسی طرح شیطان کی کوششوں کا اثر یہ ہے کہ ان کا صحیح صحیح اقرار بھی بہت کم کیا گیا ہے۔ ان عقائد کے باب میں دنیا کی اصل روش نہ انکار کی رہی ہے نہ ہمیشہ صاف صاف اقرار کی، بلکہ بیشتر اقرار مع الانکار کی رہی ہے اور یہی وہ گرہ ہے جو اس رشتہ میں بار بار پڑتی رہی ہے اور جس کو کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجتا رہا ہے۔

دعوت کی راہ کی ایک مشکل :

یہ حق و باطل دونوں کی ملاوٹ دعوت و اصلاح کے کام کو بہت مشکل اور دیر طلب بنا دیتی ہے۔ اگر مقابلہ صرف باطل سے ہو تو اس کو آسانی سے سر کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں حق و باطل دونوں ملے جلے ہوئے ہوں اور باطل کی حمایت کے لیے حق کو سپر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہو وہاں حق کی حمایت میں کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے سے پہلے داعیانِ حق کو ایک جہادِ عظیم اس مقصد کے لیے کرنا پڑتا ہے کہ وہ لوگوں پر یہ آشکارا کر سکیں کہ زیرِ بحث نظام میں اگر کچھ اجزاء حق کے ہیں تو وہ حق کی خاطر نہیں ہیں، بلکہ باطل کی خدمت کے لیے ہیں۔ انبیائے کرام کو اور ان لوگوں کو جو دنیا کو راہِ راست کی دعوت دیتے ہیں بالعموم ایسے ہی فاسد العقیدہ لوگوں سے کشمکش کرنی پڑتی ہے جو خدا کے دین اور اپنے نفس کی خواہشوں میں مصالحت کرا کے ایک نیا نظام کھڑا کرتے ہیں اور اس کو پرانے نظام کا نام دے لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے باطل کی حفاظت کے لیے چونکہ حق کو سپر بنائے ہوئے ہوتے ہیں، اس وجہ سے ان پر پوری آزادی کے ساتھ بیک دفعہ ضرب نہیں لگائی جا سکتی، بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اعمال و معتقدات میں سے حق کے اجزاء کو الگ اور باطل کے اجزاء کو الگ کرنا پڑتا ہے اور چونکہ اُن کا ہر باطل حق بن کر کچ چکا ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کی جدائی اُن کو اتنی شاق گزرتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک ایک پر مورچے قائم کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑتے جب تک اس کی حمایت سے بالکل ہی مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ کام بڑا دیر طلب ہے۔ اس میں بڑی دیدہ ریزی، بڑے صبر اور بڑے علم کی ضرورت پڑتی ہے اور ساتھ ہی بے لاگ حق پرستی بھی اس راہ میں مطلوب ہوتی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کے متعلق آدمی کا خیال یہ ہو کہ ان کے انکار کے ساتھ اقرار بھی شامل ہے، قدرتی طور پر اُن کے ساتھ جو معاملہ کرتے ہیں

وہ نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس نرمی کا بڑا فائدہ باطل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ حق کو۔

تعلیم میں دو باتوں کا لحاظ:

اس کشمکش کے نتیجہ کے طور پر جو لوگ حق خالص کا ساتھ دینے اور باطل سے اپنا رشتہ یک قلم منقطع کر لینے پر صدقِ دل کے ساتھ آمادہ ہو جاتے ہیں وہ لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو انبیائے کرام ان باتوں کی تعلیم شروع کرتے ہیں جن سے، ایک تو وہ خدا سے بہتر سے بہتر طریق پر جڑ جائیں، دوسری طرف تو آپس میں ایک بنیانِ مرصوص کی طرح مربوط ہو جائیں۔ یہ خدا اور بندوں سے ٹھیک ٹھیک جوڑ دینے والے اصول انہی تین اصولوں سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، اس وجہ سے اُن لوگوں کو ان کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی جو ان تین اصولوں کو مان چکے ہیں۔ ایک اصول کو مان لینے کے بعد کوئی دیانت دار شخص اس کے لازمی نتائج کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک شے کے لوازم کی حیثیت تو درحقیقت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوا کرتی ہے، لیکن اس تفصیل کو بھی انبیائے کرام مجرّد اس اعتماد پر کہ جن لوگوں نے اصول تسلیم کر لیے ہیں وہ لازماً ان کے نتائج کو بھی مان ہی لیں گے، یوں ہی بے ترتیب لوگوں کے سامنے پھینکنا نہیں شروع کر دیتے، بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب و تدریج کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اسی ترتیب و تدریج کے اندر ان کے مشن کی کامیابی کا اصل راز مضمر ہوتا ہے۔ اس ترتیب میں دو پہلو مدِ نظر ہوتے ہیں: ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا، دوسرا جماعت کی اجتماعی استطاعت کا۔ یہ دونوں چیزیں کسی قدر وضاحت کی محتاج ہیں

ذہنی استعداد:

ذہنی استعداد سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام و تعلیمات میں ایک نظم (سسٹم) ہے۔ اس کے کچھ بنیادی کلیات ہیں، ان سے کچھ مبادی پیدا ہوتے ہیں، پھر ان سے اصولی تعلیمات پیدا ہوتی ہیں، پھر ان سے جزئیات و فروع وجود میں آتی ہیں۔ جو شخص اس ترتیب و تدریج کے ساتھ دین کو سیکھتا ہے، وہ ایک طرف تو ہر مرحلہ میں دوسرے مرحلہ کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کر لیتا ہے، دوسری طرف اس پورے سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ ایک بچے کو پہلے حروفِ تہجی کی تعلیم دی جائے، پھر ان کو آپس میں جوڑنا اور ملانا سکھایا جائے، پھر اس کو الفاظ اور جملوں کے پڑھنے کی مشق کرائی جائے، پھر اس کے سامنے پڑھنے کے لیے ایک پوری عبارت رکھ دی جائے۔ چونکہ وہ حروف سے عبارت تک درجہ بدرجہ اس سسٹم کو سمجھتا ہوا آیا ہے، جو اس کے اندر ملحوظ ہے، اس وجہ سے ہر منزل میں اس نے آگے کی منزل کے لیے استعداد خود بخود بہم پہنچالی ہے اور کوئی چیز اس کی طبیعت پر بار نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ہر استعداد چونکہ فطرۃً نعل چاہتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے ایک درجہ سے دوسرے درجے میں منتقل ہونے کے لیے اپنی طبیعت کے اندر خود ایک تقاضا محسوس کیا ہے۔ اس کے برعکس جس شخص نے دین کو اس طرح نہیں پایا ہے، بلکہ اس کے مختلف حصے اس کے سامنے بے ربط و بے ترتیب رکھ دیے گئے ہیں اس کی مثال بالکل اس بچہ کی ہے جس کو تمام ابتدائی مراحل سے گزرے بغیر کوئی عبارت رٹا دی گئی ہو جس کو وہ رٹ تو لے گا اور حافظہ کی مدد سے اس کو دُہرا بھی سکے گا، لیکن وہ ہمیشہ اس کے حافظہ پر ایک بار بنی رہے گی، کبھی اس کی استعداد کا جزو نہیں بن سکے گی۔ انبیائے کرام علیہم السلام دین کو پیش کرنے میں یہ طریقہ کبھی اختیار نہیں کرتے، بلکہ فطری اور حکیمانہ ترتیب اختیار کرتے ہیں تاکہ جو لوگ ان کو قبول کریں، اپنی طبیعت کی طلب سے قبول کریں اور لو

دین اُن کے فکر و نظر اور روح و دل کے اندر جذب ہو جائے۔ اسی چیز سے وہ رسوخِ ایمان پیدا ہوتا ہے جو آزمائشوں سے چیر ڈالے جانے کے بعد بھی دلوں سے نہیں نکلتا اور اسی سے وہ ذوقِ تقویٰ پرورش پاتا ہے جو زندگی کے پھیلے ہوئے معاملات کے بعید ترین گوشوں میں بھی کوئی چیز روحِ دین کے خلاف برداشت نہیں کر سکتا۔

جو لوگ دین کے اس نظام کو اور انبیائے کرام کے اس طریقِ دعوت کی خوبیوں کو نہیں سمجھتے ہیں وہ لوگ معرفتِ الٰہی پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کو نہ صرف فرض نمازوں کا بلکہ تہجد و اشراق تک کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ وہ نبی کی ضرورت اور اس کی اطاعت و پیروی کا اعتقاد پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کی ڈاڑھیوں، لبوں اور پائجاموں کی پیمائش کرتے پھرتے ہیں۔ وہ آخرت پر سچا اور پکا ایمان پیدا کرنے سے پہلے لوگوں پر خشیت، تقویٰ، تواضع اور فروتنی کا جمال دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان الٹی کوششوں سے ایک حد تک ڈاڑھیاں لمبی تو ہو جاتی ہیں، ازاریں اپنے حد کے اندر تو آجاتی ہیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے، ہر چیز میں ایک مصنوعی مسکینی تو نمایاں ہو جاتی ہے، کھانے پینے، کھانسنے اور چھینکنے، ہر چیز میں پابندیٔ سنت کا التزام و اہتمام بظاہر پیدا تو ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ یہ سب کچھ غیر عقلی اور غیر فطری طریقہ پر پیدا کیا جاتا ہے، اس وجہ سے اس تمام مہمِ تقویٰ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ 'مچھر چھانے جاتے ہیں اور اونٹ نگلے جاتے ہیں'۔ اس طرح کے اتقیا وہ نہیں دیکھتے کہ جو لقمہ حلق میں جا رہا ہے وہ پاک و طیب ہے یا طاغوت کی خدمت کر کے حاصل کیا گیا ہے، لیکن اس امر کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں کہ اس لقمۂ حرام کو کھانے کے بعد پانی داہنے ہی ہاتھ سے پئیں، بائیں ہاتھ سے نہ پئیں۔ یہی لوگ ہیں جن کا دینی تصور یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی نیت خالص ہے تو وہ کسی نظامِ باطل کے اندر تھانہ داری، ڈپٹی کمشنری اور کونسلوں کی ممبری سب کچھ کر کے اللہ کو راضی اور اسلام کے جھنڈے کو اونچا کر سکتا ہے۔ انہی متقیوں کے اندر ایسے لوگ

بھی آپ کو مل جائیں گے جو اپنی خوش قسمتی پر بہت نازاں ہیں کہ انہیں اپنی لڑکی کے لیے ایسا دیندار بر ملا ہے کہ اس کی ازار ٹخنوں سے کبھی نیچے نہیں ہوتی اور 'فلاں حضرت' کا مرید ہے، لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ اس نے اپنی معاش کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا ہے کوئی مسلمان حس ایمانی رکھتے ہوئے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سارا بے تکا پن درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ایک مدت سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی دعوت نہیں اٹھی جو ان کے سامنے ان کے پورے دین کو اس کے سسٹم کے ساتھ پیش کرتی اور تبلیغ و دعوت کے ہر مرحلہ میں دین کا جس قدر حصہ لوگوں کو دیتی اس کے پورے مقتضیات ان پر واضح کر دیتی۔ بلکہ جن لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں کوئی کام شروع کیا۔ اصلی ضرورت کا شعور اور نظام دین کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جہاں سے چاہا شروع کیا اور جہاں چاہا ختم کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن مسلمانوں کے اندر کچھ دینی شعور ہے بھی وہ اس قدر الٹا اور بے جان ہے کہ اس کو کسی صحیح دعوت کے لیے بنیاد بنانا تو درکنار اس کو قائم رکھ کر کوئی صحیح دعوت شاید شروع بھی نہیں کی جا سکتی۔

جماعتی استطاعت :

اب اسی طرح بالاجمال اس اجتماعی استطاعت کی حقیقت پر غور کیجیے جس کو حضرات انبیائے کرام علیہم السلام دین کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں۔ دین کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو طرح کے ہیں : ایک انفرادی احکام دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام افراد کے لیے ہوتے ہیں اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی حیثیت ہی میں ان کی تعمیل ضروری ہے، مثلاً نماز، روزہ، انفاق وغیرہ۔ اجتماعی احکام کا تعلق جماعت سے ہے جب جماعت وجود میں آجائے تو یہ اس کا فرض ہے کہ ان کی تعمیل کرے، مثلاً وہ احکام جو معاشرت و سیاست اور جہاد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کی تعلیم و دعوت

میں افراد کے تحمل اور ان کی قوت برداشت کا لحاظ ہوتا ہے کہ احکام و قوانین ان پر بارش کی طرح برسا نہ دیے جائیں کہ وہ گھبرا کے سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ دوسری قسم کے احکام میں جماعت کے تحمل کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ جو احکام اس کو دیے جا رہے ہیں ان کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس جماعتی استطاعت کا لحاظ نہایت ضروری بھی ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہایت مشکل بھی ہے۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو تو اس معاملہ میں براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی ہے، کیونکہ ان کے اوپر احکام و قوانین نازل ہی جماعت کی قوت و استعداد کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ انبیاء کے طریقہ پر کسی جماعت کو اٹھانا چاہتے ہوں، ان کو اس معاملہ میں سراسر اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک انہیں احکامِ دین کی ترتیبِ نزول، اپنے وقت کے خاص حالات اور ایک نبی اور غیر نبی کی جماعت کے فرق کا پورا پورا اندازہ نہ ہو، کبھی ان کا قدم صحیح راہ پر نہیں پڑ سکتا اور ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس جماعت کی وہ قیادت کر رہے ہیں اس کی کشتی ساحل پر پہنچنے سے پہلے ہی کسی چٹان سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جائے۔

جو لوگ اس امر سے واقف نہیں ہیں وہ پورے قرآن مجید کو اپنے سامنے رکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پورا کا پورا ایک ہی دن میں اتارا گیا تھا اور اس پورے کے پورے کو ایک ہی دن میں جاری و نافذ ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ ایک طرف توحید کی دعوت شروع کریں گے، دوسری طرف اسلامی نظامِ قضا کی داغ بیل بھی ڈال دیں گے؛ ایک طرف کفر بالطاغوت کی شرح شروع کریں گے، دوسری طرف طاغوت کو الٹی میٹم بھی بھیج دیں گے۔ ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہے کہ کسی سرزمین کے نظامِ جاہلی کو نظامِ اسلامی سے بدل دینے کے لیے جو دعوت اٹھتی ہے اس میں جماعت کی اجتماعی قدرت و استطاعت کا کس قدر صحیح اندازہ کر کے قدم اٹھانا پڑتا ہے اور اگر اس اندازہ میں ادنیٰ غلطی بھی ہو جائے تو کیا خطرے متصور ہیں؛

یہاں اس بات کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن میں معاشرت اور سیاست سے متعلق سارے احکام اس وقت نازل ہوئے جب کہ دارالاسلام بالفعل قائم ہو چکا تھا اور ان احکام کے نازل ہونے میں بھی ایک ترتیب و تدریج ہے اور یہ ترتیب و تدریج جماعت کی استطاعت کے بالکل متوازی ہے جب مسلمان اتنی تعداد میں ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ایک علیحدہ ہیئت اجتماعی کی تشکیل کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہیں ایک آزاد گوشۂ زمین بھی مل جاتا ہے، تب انہیں نظامِ کفر سے قطع تعلق کا آخری حکم دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جب مسلمانوں کی جماعتی قوت کم از کم اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر کے مقابلے میں ٹھہر سکیں، تب انہیں لڑائی کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ علی ہٰذا القیاس جب مسلمان اس حیثیت میں ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک مستقل نظامِ معاشرت و نظامِ معیشت کو چلا سکیں، تب انہیں نظامِ کفر سے ہر طرح کے معاشرتی قطع تعلق کا حکم دیا جاتا ہے اور اسلام کے وہ قوانین و احکام نازل ہوتے ہیں جو مدنی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ پھر جب مسلمان وہ سیاسی طاقت بہم پہنچا لیتے ہیں کہ بغیر کسی اندیشۂ مزاحمت کے خدا کی زمین پر خدا کے احکام کو جاری و نافذ کر سکتے ہیں، تب ان کو وہ احکام و قوانین دیے جاتے ہیں جن کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے ہے۔ ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کی طرح ایک جماعت کی مادی استعداد بھی تدریجاً ہی بڑھتی ہے اور جو لوگ کسی جماعت کی قیادت کرتے ہیں ان کو سب سے زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ جماعت کی اس استعداد ہی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جماعت پر کوئی بوجھ ڈال دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو استعداد اس نے ایک مدت میں فراہم کی ہے وہ ساری کی ساری برباد ہو جائے گی۔

اسی حقیقت کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اشارہ فرمایا ہے:

انما نزل اول ما نزل منہ   قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل کی

سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار — حتى إذا ثاب الناس إلى الإسلام نزل الحلالُ والحرامُ — ولو نزل أولَ شيءٍ: لا تشربوا الخمرَ لقالوا لا ندعُ الخمر أبدًا — ولو نزل: لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا أبدًا۔[1]

گئی وہ مفصل کی ایک سورہ ہے جس میں دوزخ اور جنت کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے دائرے میں آگئے تب حلال وحرام کے احکام اترے اور اگر بالکل شروع ہی میں حکم آجاتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر یہ حکم دیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز زنا نہ چھوڑیں گے

---

۱ صحیح البخاری: کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن

باب ۶

دعوت کے طریقے

بعض دینی حلقوں میں خدا جانے یہ خیال کہاں سے پھیل گیا ہے کہ تبلیغ کا معیاری اور پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ میں ایک لٹھیا اور جھولی میں تھوڑے سے چنے لے اور تبلیغ کے لیے نکل کھڑا ہو۔ نہ پاؤں میں جوتی ہو نہ سر پہ ٹوپی، گاؤں گاؤں میں پھرے اور جس جگہ کوئی شخص مل جائے، خواہ وہ سنے نہ سنے، اس پر تبلیغ شروع کر دے۔ اگر کسی شہر میں گزر ہو تو وہاں جس نکڑ یا چوراہے پر چار آدمی نظر آ جائیں وہیں تقریر کے لیے کھڑا ہو جائے۔ ریل میں، اسٹیشن پر، بازار میں، سڑک پر جس جگہ کوئی بھیڑ مل جائے وہیں اُس کا وعظ شروع ہو جائے۔ ہر مجلس میں گھس جائے۔ ہر کانفرنس میں اپنی جگہ پیدا کرے۔ ہر پلیٹ فارم پر جا دھمکے۔ سننے والے تھک تھک جائیں، لیکن وہ سنانے سے نہ تھکے۔ لوگ اس کے تعاقب سے گھبرا گھبرا جائیں، لیکن وہ خدائی فوجدار بنا ہوا ہر ایک کے سر پر مسلط رہے۔ لوگ اس کے سوال و جواب کے ڈر سے چھپتے پھریں، بلکہ بسا اوقات آزردہ ہو کر گستاخیاں اور بدتمیزیاں بھی کر بیٹھیں، لیکن وہ اسی انہماک و جوش کے ساتھ اپنا کام جاری رکھے۔ جہاں وعظ کی فرمائش کی جائے، وعظ کہہ دے۔ جہاں میلاد کی خواہش کی جائے، میلاد پڑھ دے۔ اور جہاں مخالفین و منکرین سے سابقہ پڑ جائے، وہاں خم ٹھونک کے میدانِ مناظرہ میں بھی اتر پڑے۔ یہ ہے تبلیغ کا اصلی طریقہ اور یہ ہے

ایک سچے مبلغ کی صحیح تصویر جو ہمارے بہت سے دین دار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے تبلیغ و تعلیم کے موجودہ ترقی یافتہ اور سائنٹیفک طریقوں کے تھوڑے بہت مفید ہونے سے لگن ہے یہ لوگ منکر نہ ہوں، لیکن خیر و برکت والا طریقہ ان کے نزدیک یہی ہے جس کو، ان کے خیال میں حضرات انبیاء نے اختیار فرمایا۔

ہمارے نزدیک اس طریقہ کو انبیاء کا طریقہ سمجھنا کچھ تو انبیاء کے طریقہ سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور کچھ ان حضرات کی اس خواہش کا کہ ان کا اپنا اختیار کیا ہوا طریقہ ——— جس کے سوا کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں ——— ایک محترم و مقدس طریقہ ثابت ہو جائے۔ انبیاء کے طریقۂ تبلیغ کا جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ و ترقی یافتہ طریقے تھے اور یہ طریقے حالات کے تغیر اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں ہے۔ بلکہ داعیانِ حق کو چاہیے کہ وہ ہر زمانہ میں تبلیغ و تعلیم کے لیے وہ طریقے اختیار کریں جو ان کے زمانوں میں پیدا ہو چکے ہوں اور جن کو اختیار کر کے وہ اپنی کوششوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنا سکتے ہوں۔

علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ دعوت کے طریقوں میں ترقی :

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے کام میں جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی ایک ہی طریقہ پر اصرار نہیں کیا ہے بلکہ جس رفتار سے دنیا میں علم و فن ترقی کرتا گیا ہے اسی اعتبار سے ان کی تبلیغ و تعلیم کے طریقے بھی بدلتے گئے ہیں۔ ابتدائی دورِ تمدن میں جب لکھنے پڑھنے کا فن وجود میں نہیں آیا تھا، انبیاء کی

تعلیم و تبلیغ بھی زبانی تھی۔ نیکی اور سچائی کے کچھ اصول وہ لوگوں کو زبانی آکر تلقین کر دیتے اور لوگ ان کو یاد کر لیتے جو نسلاً بعد نسلٍ، روایات کی شکل میں، ان کے ماننے والوں میں منتقل ہوتے رہتے۔ یہاں تک کہ جب امتدادِ زمانہ سے وہ اصول فراموش ہوجاتے یا ان کے اندر دوسری آمیزشیں ہوجاتیں تو اللہ تعالیٰ کسی اور نبی کو بھیجتا جو اگر اس تعلیم کو ازسرِنو تازہ کر دیتا۔ جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تبلیغ کے معاملے میں سارا اعتماد صرف شخصی ارتباط، زبانی اظہار و بیان اور سامعین کی قوتِ حافظہ پر رہا۔ لیکن جب انسان نے تحریر کا فن ایجاد کر لیا اور لوگوں تک کسی چیز کے پہنچانے اور اس کو ان کے اندر محفوظ رکھنے کا ایک اور ترقی یافتہ طریقہ پیدا ہوگیا تو انبیائے کرام نے اس کو بھی اختیار فرمایا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے زبانی تلقین کے بجائے تورات کے احکام اپنی قوم کو تختیوں پر لکھ کر دیے۔ اسی طرح عربوں کو دین کی تعلیم مستلم ـــــ تحریر ـــــ کے ذریعہ سے دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اس بات کا احسان جتایا ہے کہ ان کو صرف زبانی تعلیم کے بجائے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی ہے، جو تعلیم کا ایک اعلیٰ اور محفوظ ترین ذریعہ ہے:

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العلق - ۹۶ : ۳ - ۵)	پڑھ اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے تعلیم دی قلم کے واسطہ سے۔ اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا۔

ان آیات سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے انسان کو قلم کے استعمال کا ڈھنگ سکھایا اور پھر اس کے اس ترقی یافتہ طریقہ کو تعلیمِ دین کا ذریعہ بنایا جس کی وجہ سے وہ لائق ہوا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ـــــ کتاب ـــــ بخشی جائے۔ زبانی تعلیم کے مقابلے میں قلم اور کتاب کی تعلیم کو جو ترجیح

حاصل ہے اور اس میں اتمامِ حجت اور تبلیغ کامل کے جو پہلو ہیں، ان کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارات کیے ہیں، لیکن یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ یہاں ہم جس بات کو سامنے لانا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انبیاء کا طریقۂ تبلیغ کوئی جامد طریقہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی علمی و ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں اور ترقیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ سائنس اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل کار اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں، ان سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا حق داعیانِ حق کو ہے۔ مثلاً آج پریس، سینما، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ نے انسان کے پروپیگنڈے اور تعلیم و تبلیغ کی قوت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ایک بڑی سے بڑی تقریر چند منٹوں کے اندر اندر دنیا کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ کسی وسیع سے وسیع تحریک سے چند دنوں کے اندر اندر دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسانوں کو آشنا کیا جا سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل باتیں بہت معمولی محنت سے عوام و خواص سب کے ذہن نشین کرائی جا سکتی ہیں۔ اس زمانہ میں اہلِ باطل انھی ذرائع سے کام لے کر اپنے جس باطل کو چاہتے ہیں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیتے ہیں۔ ان ایجادات نے دنیا کی تمام دوریوں اور تمام فاصلوں کو لپیٹ کر رکھ دیا ہے۔ قوموں اور قوموں کے درمیان اب سمندروں اور پہاڑوں کے پردے کوئی روک نہیں بن سکتے ہیں۔ کل تک ایک سکول کا ماسٹر جس طرح اپنی بات اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو سنا سکتا تھا، آپ آج چاہیں تو اسی طرح اس پورے کرۂ ارض کے انسانوں کو اپنی بات سنا سکتے ہیں۔ کل تک جس چیز کی تعلیم پر مہینوں اور سالوں صرف کر کے آپ اس کو ذہنوں میں راسخ نہیں کر سکتے تھے، آج اگر چاہیں تو موجودہ سائنٹفک ذرائع سے کام لے کر کسی شہر کے عوام و خواص، سب کو چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کا عالم بنا دے سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ آج حق کی تبلیغ دین کے لیے ان ذرائع پر قبضہ کیا جائے۔ اگر اہلِ حق یہ خیال کر کے ان چیزوں کو نظر انداز

کردیں گر انبیاء نے تبلیغ دین کے کام میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ ایک ایک شخص کے پاس پہنچ کر ہی اس پر تبلیغ کی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے لیے بھی اولیٰ یہی ہے کہ ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں، بلکہ گھر گھر پہنچ کر ہی لوگوں کو تبلیغ کریں تو یہ انبیاء کے طریقہ کی پیروی نہیں ہوگی، بلکہ یہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہوگا جو وہ آپ کو اس لیے دے رہا ہے کہ جب تک آپ اپنے دین دارانہ طریقہ پر چل کر دو آدمیوں سے کوئی بات کہیں، اس وقت وہ ان سائنٹیفک وسائل سے کام لے کر ہزاروں لاکھوں، بلکہ کروڑوں انسانوں تک اپنی دعوت باطل نہایت مؤثر طریقہ پر پہنچا دے۔ شیطان نے اسی طرح کے دھوکے دے کر اکثر اہل حق کی کوششوں اور قابلیتوں کو نقصان پہنچا دیا ہے اور ان کے مقابل میں خود اپنا پلہ بھاری رکھا ہے، یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اب زندگی کے ہر میدان میں یہ پیچھے ہو گئے ہیں اور وہ آگے آگے قوموں کی امامت کر رہا ہے اور دونوں کی کوشش کے نتائج میں سرے سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اور یہی صورت حال اس وقت باقی رہے گی جب تک اہل حق ان زبردست قوتوں کو حق کی خدمت میں استعمال کرنے کا ڈھنگ نہ سیکھ جائیں جو آج سو فی صد شیطان کے تصرف میں ہونے کی وجہ سے یکسر باطل کی خدمت میں صرف ہو رہی ہیں۔

اجتماعی ترقیوں سے استفادہ :

دعوت کا طریقہ جس طرح سائنٹیفک نقطۂ نظر سے بہت اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہونا چاہیے، تاکہ باطل سے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ ہو سکے۔ اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی پہلو سے زندگی میں جو ترقیاں ہو چکی ہیں ان سے بھی اس سلسلہ میں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، تاکہ دعوت وقت کے معیار کے لحاظ سے پوری طرح باوقار ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے اندر آپس میں مل بیٹھنے، باہم دگر تبادلۂ خیالات کرنے، اپنے

خیالات کو سنانے اور دوسروں کے خیالات کے سننے، کسی امر کو اجتماعی طور پر طے کرنے کے جو طریقے رواج پا چکے ہیں، اگر ان میں کوئی اخلاقی و شرعی قباحت نہیں ہے، تو اہلِ حق ان کو اپنائیں اور تبلیغِ حق میں ان سے کام لیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان تمام طریقوں سے فائدہ اٹھایا جو اس عہد کی معاشرت اور اجتماعی زندگی میں نشوونما پا چکے تھے اور دعوت کے نقطۂ نظر سے کارآمد تھے۔ اوّل اوّل جب آپ نے اپنے خاندان کے لیڈروں کو جو درحقیقت قوم کے بھی لیڈر تھے اپنے مقصد سے آگاہ کرنا چاہا تو اس کے لیے طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کریں اور تمام خاندانِ مُطّلب کو کھانے پر بلائیں۔ حضرت علیؓ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پورا خاندانِ مُطّلب جمع ہوا۔ حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ اور ابوطالب، سب لوگ دعوت میں شریک ہوئے۔ جب لوگ کھانا کھا چکے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ "میں آپ لوگوں کے پاس ایک ایسی چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کی سعادت کی کفیل ہے"۔ پھر آخر میں حاضرین سے سوال فرمایا کہ "اس بارِ گراں کو اٹھانے میں آپ میں سے کون میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟" اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد حضرت علیؓ نے ایک گوشہ سے اٹھ کر نہایت مؤثر الفاظ میں فرمایا کہ "گو مجھے آشوبِ چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نوعمر ہوں تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔"

اس طریقہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے عام طریقے بھی اختیار فرمائے جو دعوت کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔ مثلاً مکّہ اور طائف کے سرداروں سے ملنے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے خود تشریف لے جاتے، حج کے زمانے میں جو قبیلے مکّہ کے آس پاس آکر ٹھہر جاتے آپ اُن کے سرداروں سے ملتے اور ان کو

دعوتِ اسلام دیتے، بعض مقامات پر یا بعض خاص خاص لوگوں کے پاس اپنے نمائندے بھی بھیجتے۔ عرب میں کچھ موسمی بازار لگتے تھے جن میں ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے، اور یہ بازار صرف خرید و فروخت اور کھیل تماشوں ہی کے بازار نہ تھے، بلکہ وقت کے معیار کے لحاظ سے ان میں علمی اور ادبی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ آپؐ ان بازاروں میں بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کے سامنے دعوت پیش کرنے کے موقعے پیدا کرتے۔ بہت سے لوگوں کو آپؐ نے خطوط کے ذریعے سے بھی دعوت دی۔ غرض اس زمانے میں لوگوں کو کسی چیز سے قریب کرنے یا لوگوں سے قریب ہونے کے جو طریقے پیدا ہو چکے تھے، اگر ان میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہر عہد میں لوگ انہی طریقوں سے مانوس ہوتے ہیں جو اس عہد کی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رواج پا چکے ہوتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں انہی طریقوں کو اختیار کیا جائے جو ان کے مزاج اور حالات کے مناسب ہیں۔ جس طرح لوگ ملتے ہیں اسی طرح ان سے ملا جائے، جس طرح لوگ کسی بات کو سنتے ہیں، اسی طرح ان کو سنانے کی کوشش کی جائے۔ جس طریقِ کار کو لوگ باوقار سمجھتے ہیں اُسی طریقِ کار کو اختیار کیا جائے۔ اگر ایک داعی —— بالخصوص ایک داعیِ حق —— ان طریقوں کے اختیار کرنے سے محض اس وجہ سے گریز کرے کہ یہ طریقے اس کے اپنے مذاق کے خلاف ہیں، یا وہ ان کو اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا ان طریقوں پر قدامت کی مہر نہیں لگی ہوئی ہے، اس وجہ سے اس خیال میں وہ معیاری نہیں ہیں، تو ان باتوں کا لازمی نتیجہ اس کی دعوت کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوگا اور اس کے اخلاصِ نیت کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی اس کی دعوت کو اس انجام بد سے نہ بچا سکے گی۔ اگر ایک شخص آج دعوتِ دین کے لیے یورپ یا امریکہ کے کسی ملک میں جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا ربط بڑھانے اور اُن کے اندر اپنے خیالات پھیلانے کے وہی ذرائع اور وہی طریقے

اختیار کرے جو وہاں کی اجتماعی اور تمدنی زندگی میں رواج پا چکے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا، یا نہیں کرنا چاہتا، بلکہ مُصر ہے کہ وہ سڑکوں پر چل پھر کر ہی لوگوں کو کلمہ اور نماز سکھائے گا تو خواہ یہ شخص کتنا مخلص ہو، لیکن وہ اپنے اس بے ڈھنگے پن سے اپنی محنت بھی رائگاں کرے گا اور کلمہ اور نماز کی عزت بھی خاک میں ملائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک داعیِ حق کی احتیاط صرف اس حد تک ہونی چاہیے کہ وقت کے مقبول اور رائج طریقوں میں سے وہ ان طریقوں کو نہ اختیار کرے جن میں اخلاقی پہلو سے کوئی خرابی ہو اور اگر اس طرح کا کوئی طریقہ کسی خاص ضرورت سے اختیار کرنا ہی پڑ جائے تو ضروری ہے کہ اس کو اس اخلاقی برائی سے پاک کر کے اختیار کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل اوّل اوّل اپنی قوم کو غفلت سے بیدار کرنے اور لوگوں کو اپنی بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوہ صفا پر چڑھ کر نعرہ لگایا۔ اس کی اصلی شکل عرب جاہلیت میں یہ تھی کہ خطرہ کی شدت کا اظہار کرنے کے لیے نعرہ لگانے والا اپنے سارے کپڑے اتار کر بالکل ننگا ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ عربی میں اس کو نذیر عریاں کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جمع کرنے کا طریقہ تو وہی اختیار فرمایا جو ایک نذیر عریاں کا ہوتا تھا، لیکن ننگے ہو جانا چونکہ ایک سخت قسم کی بے حیائی اور بداخلاقی تھی، اس وجہ سے آپ نے اس برائی سے اس طریقہ کو پاک کر لیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مجلسی اور اجتماعی طریقے پیدا ہو چکے ہیں ان میں اگر کوئی پہلو برائی کا ہے تو اس برائی کی وجہ سے ان کو یک قلم رد کر دینا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ صرف یہ چاہیے کہ ان طریقوں کو برائیوں سے پاک کر کے ان کو مقصدِ حق کے لیے استعمال کیا جائے۔

آج متمدن ملکوں میں کسی تحریک کو لوگوں کے اندر پھیلانے کے جو بے شمار طریقے پیدا ہو چکے ہیں وہ جس طرح برائیوں کو پھیلانے میں کارآمد ہیں، اسی طرح بھلائیوں کو پھیلانے میں بھی نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ

برائیوں سے بچ کر ان سے فائدہ اٹھایا جائے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج جو لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر مقاصد کے لیے بھی ان کو بدتر سے بدتر بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ جہاد جیسے مقدس مقصد کے لیے اگر روپیہ جمع کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے بینا بازار لگائیں گے اور اس میں حسن فروشی اور بے حیائی کو جلبِ زر کا ذریعہ بنائیں گے۔ مہاجرین کی امداد جیسے اعلیٰ اور برتر کام کے لیے اگر فنڈ قائم کرنا چاہیں گے تو رقص و سرود اور پیانو نوازی کی مجلسیں منعقد کریں گے اور ناچ رنگ اور غمزہ و عشوہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کے جذبۂ انفاق کو حرکت میں لائیں گے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر تحریکِ جذبات کے لیے کوئی اور محرک نہیں ملے گا تو کچھ شعراء حضرات کی خدمات حاصل کر کے انہی کو آمادہ کریں گے کہ کچھ وہی اپنی نغمہ طرازیوں اور مجلس آرائیوں سے دلوں کو گرمائیں اور لوگوں کے ایمان کو بیدار کریں۔ قوم کے فسادِ مذاق کی وجہ سے جن چیزوں کے اندر بھلائی کا کوئی پہلو موجود ہوتا بھی ہے وہ بھی برائی کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں تو اس بات کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ یہ کسی برائی کو مٹا کر اس کی جگہ کسی بھلائی کو لائیں گے۔ تاہم اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ جن چیزوں کے اندر کوئی پہلو برائی کا ہے ان کی برائی کی اصلاح کر کے مقصدِ حق کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے ان کو یک قلم نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔

یہ دو اصولی ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ملحوظ رکھنے کی ہیں، جو ایک داعیٔ حق کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں اختیار کرنے ہیں۔ اب بعض ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ہم ذکر کریں گے، جن سے بہرحال ایک داعیٔ حق کو احتراز کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ داعی کو کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو دعوت یا داعی کے وقار یا دعوت کے مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی باتیں جو دعوت یا داعی کے وقار یا دعوت کے مفاد کے خلاف ہوں، بہت سی ہو سکتی ہیں۔ ان سب کو گنانا

بہت مشکل ہے۔ صرف بعض باتیں ہم بطور مثال ذکر کریں گے، جن سے فی الجملہ اندازہ ہوسکے گا کہ داعیانِ حق کو کس قسم کے طریقوں سے بچنا چاہیے۔

خلافِ وقار طریقوں سے احتراز :

ایک داعیٔ حق کو اپنی دعوت کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے ان تمام طریقوں سے بچنا چاہیے جس سے دعوت کی شان یا خود داعی کے وقار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اپنے کام میں غیر معمولی انہماک اور لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کی زیادہ سے زیادہ خواہش ایک داعی کی بہترین خصوصیت ہے، لیکن اس انہماک اور اس خواہش کو اتنا نہیں بڑھ جانا چاہیے کہ نہ داعی کو اپنے نفس کے حقوق کا کچھ ہوش باقی رہ جائے، نہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا کچھ خیال باقی رہے اور نہ اپنی دعوت ہی کے مرتبہ و مقام ہی کی کچھ ایسی پروا رہ جائے۔ جو سننا نہیں چاہتے ان کو سنانے کے درپے ہونا، بھاگنے والوں کے پیچھے پڑنا، نفرت کرنے والوں کو پرچانا اور گھمنڈ کرنے والوں کی تواضع کرنا بس وہیں تک جائز ہے کہ داعی کی خودداری اور دعوت کی عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور نہ دعوت کے کام میں کوئی پہلو ابتذال اور اوچھے پن کا پیدا ہونے پائے۔ اگر معاملہ اس حد سے آگے بڑھتا نظر آئے تو جس حق کی محبت داعی کو ان تمام نیاز مندیوں پر مجبور کر رہی ہے، اسی حق کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ پوری خودداری کے ساتھ ایسے لوگوں سے الگ ہو جائے اور صرف ان لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جن میں حق کی طلب اور علم کی پیاس موجود ہے۔ سورۂ عبس کی مندرجہ ذیل آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں کے ساتھ اسی طرح کی نیاز مندی سے روکا گیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس بلند رتبہ دعوت کو لے کر تم اٹھے ہو وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو اس قدر جھک کر پیش کیا جائے۔ ان آیات میں قرآن کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی بلندی

کا ذکر اسی مقصد سے کیا گیا ہے کہ یہ بلند مرتبہ کلام جس کے آگے پیش کیا جائے اس کو پیش کرتے وقت اس کے مرتبہ کا لحاظ رہے کہ یہ خدا کا فرمان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے :

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ لَهٗ	جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم
تَصَدّٰى ۚ وَمَا عَلَيْكَ	پیچھے پڑتے ہو، حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری
اَلَّا يَزَّكّٰى ۚ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ	نہیں اگر وہ اپنی اصلاح نہ کرے اور جو
يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَاَنْتَ	تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور وہ
عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ	خدا سے ڈرتا بھی ہے تو تم اس سے بے پروائی
فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۚ فِىْ صُحُفٍ	برتتے ہو۔ ہرگز نہیں، یہ تو ایک یاددہانی
مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ	ہے تو جو چاہے یاددہانی حاصل کرے۔ لائقِ
بِاَيْدِىْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ ؕ	تعظیم، بلند اور پاکیزہ صحیفوں میں، معزز باوفا
(عبس - ۸۰ : ۵ - ۱۶)	کاتبوں کے ہاتھوں میں۔

تبلیغ کے جوش میں یہ بات جائز نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں چاہے جا دھمکے اور کوئی متوجہ ہو یا نہ ہو، لیکن وہ اپنی بات سنائے بغیر نہ ٹلے اور نہ یہ بات جائز ہے کہ چھٹے دالے گداؤں کی طرح جو راہ گیر مل جائے اس کے پیچھے پڑ جائے اور جب تک اس کو کچھ سنا نہ لے یا اس سے کچھ سن نہ لے اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ :

ولا الفينك تاتى القوم وهم فى	میں تمہیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی جماعت کے
حديث من حديثهم فتقصّ	پاس جاؤ اور وہ اپنے کسی اور کام میں مشغول ہوں
عليهم فتقطع عليهم حديثهم	اور تم ان کی بات کاٹ کر ان کو اپنا وعظ سنانا شروع
فتملّهم ولكن انصت فاذا ...	کر دو اور وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگیں بلکہ تمہیں چاہیے کہ تم

امروك فحدثهم وهم يشتهونه[1]

خاموش رہو اور جب لوگ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں ۔

کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیے جس سے دعوت لوگوں پر بوجھ بن جائے، اور وہ اس سے گھبرانے لگ جائیں :

عن أبي وائل قال: كان عبد الله ابن مسعود يذكّر الناس في كل خميس. فقال له رجل: يا أبا عبد الرحمن لوددتُ أنك ذكّرتنا كل يوم. قال: أما إنه يمنعني من ذلك أني أكره أن أُملّكم وإني أتخوّلكم بالموعظة كما كان النبي صلى الله عليه وسلم يتخوّلنا بها مخافة السآمة علينا[2]

ابو وائل سے روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ اے ابو عبد الرحمن! میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہا کریں۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ناغہ کر کے نصیحت سنایا کرتے تھے کہ ہم بیزار نہ ہو جائیں ۔

مخالف مقصد طریقوں سے احتراز :

داعی حق کو کبھی کوئی طریقہ ایسا نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اپنی فطرت کے لحاظ

---

1 صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب ۲۰

2 صحیح البخاری، کتاب العلم، باب من جعل لاهل العلم ایاما معلومة۔

دعوت کے مقصد کے بالکل منافی ہو، مثلاً مناظرہ کا طریقہ۔ یہ طریقہ اگرچہ ایک مدت سے دعوت وتبلیغ کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کی اسی اہمیت سے ہمارے اہلِ فن نے اس پر کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں، جو عربی مدرسوں میں بھی پڑھائی جاتی ہیں، لیکن دعوتِ حق کی روح سے جس قدر بعید طریقہ یہ ہے اس قدر بعید کوئی اور طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجادلہ اور محاجہ کی اجازت دی ہے، لیکن ان لفظوں کا مفہوم یہ مناظرہ سمجھ لینا جس کی تعلیم ہماری دینی درس گاہوں میں دی جاتی ہے اور جس کے اکھاڑے آئے دن ہمارے مبلغین اور مناظرین جماتے رہتے ہیں، بالکل غلط ہے۔ چونکہ ہمارے اہلِ مناظرہ کا زیادہ تر استدلال قرآن مجید کے انہی دو لفظوں سے ہے، اس وجہ سے ہم مختصراً ان دو لفظوں کا مفہوم قرآن سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ انبیاء کے مجادلہ اور محاجہ اور مروجہ مناظرہ کا فرق واضح ہو سکے۔

قرآن نے کس مجادلہ کی اجازت دی ہے:

قرآن مجید میں دو طرح کے مجادلہ کا ذکر آتا ہے: ایک مجادلۂ باطل، دوسرا مجادلۂ حسن۔ مجادلۂ باطل کو قرآن نے کفار اور معاندین کی طرف منسوب کیا ہے اور اس کی خصوصیات تقریباً وہی بیان کی ہیں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں میں پائی جاتی ہیں۔ وہی اپنی بات پر بلا کسی دلیل معقول کے اصرار، وہی غیر متعلق باتوں میں اصل مسئلہ کو الجھانے کی کوشش، وہی بے فائدہ بحثوں میں تضیعِ وقت، وہی اپنے حریف کی بات کو نہ خود سننا نہ کسی کو سننے دینا، وہی لایعنی موشگافیاں اور بے نتیجہ زبان درازیاں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں کی خصوصیات میں شامل ہیں قرآن مجید نے بھی مجادلۂ باطل کی یہی خصوصیات بتائی ہیں اور اہلِ حق کو نہایت سختی کے ساتھ اُن سے روکا ہے اور صرف احسن طریقے سے مجادلہ کی اجازت دی ہے اور اس احسن طریقہ

کی وضاحت علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے خود کردی ہے تاکہ اس کو ہر شخص اچھی طرح سمجھ جائے۔

اس کا علمی طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مخاطب سے لڑائی کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کی جائے کہ جن اصولوں میں اس کے ساتھ اشتراک و اتحاد ہے، اور جن کو تسلیم کرنے سے اس کو انکار نہیں ہے ان کو اس کے سامنے واضح کیا جائے تاکہ وہ داعی کی بات سننے کی طرف راغب ہو اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے جو اس کے اپنے اقرار کردہ اصولوں سے لازمی طور پر نکلتے ہیں تاکہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر قبول کرنے کی طرف مائل ہو، اپنے حریف کا دعویٰ سمجھ کر اس کی تردید کا جذبہ اس کے اندر نہ پیدا ہو۔ اس کی نہایت عمدہ مثال بھی خود قرآن نے پیش کردی ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ	اور اہل کتاب سے نہ بحث کرو مگر اس طریقہ
اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ	پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان میں سے
ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا	ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز
بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ	پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا
اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ	تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی
وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔	فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

(العنکبوت - ۲۹ : ۴۶)

اس آیت میں پہلے تو یہ بات واضح کردی کہ جو شریر اور مفسد لوگ ہیں، جو صرف جھگڑنا چاہتے ہیں اور حق کو سمجھنے اور ماننے کا کوئی جذبہ اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں، اُن کو سرے سے منہ ہی نہ لگایا جائے۔ البتہ جو حق کے طالب ہیں ان سے گفتگو کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آغازِ گفتگو ان اصولوں سے کیا جائے جو ہمارے اور ان کے درمیان مسلّم ہیں۔

اسی اصول کے مطابق اہلِ کتاب کے سامنے توحید کی دعوت ایسے الفاظ میں پیش کی گئی ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ جب اہلِ ایمان اور اہلِ کتاب میں توحید ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے مسلّم ہے تو پھر اس کے نتائج اور مقتضیات میں باہم اختلاف کیوں ہو۔ جب اہلِ کتاب نے اس اصل کو مان رکھا ہے تو چاہیے کہ ان لازمی نتائج کو بھی تسلیم کریں جو اس سے نکلتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا	کہہ دو: اے اہلِ کتاب! اس چیز کی طرف
اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں
اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ	مشترک ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی
بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا	عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی
بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا	ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔
بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔	اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو
(آل عمران - ۳ : ۶۴)	کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔

قرآن نے مجادلہ کی عملی مثالیں جو نقل کی ہیں اور جن کی تعریف فرمائی ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ درحقیقت نام ہے اس بات کا کہ اپنی بات منوانے کے لیے مخاطب پر محبت، اعتماد، حسنِ اخلاق اور حسنِ استدلال سے گھیرے ڈالے جائیں یہاں تک کہ وہ داعی کی دل سوزی، اس کی بے لوثی اور اس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس کی بات کی صداقت پر غور کرنے اور اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن نے اس طرح کے متعدد مجادلے نقل کیے ہیں، جن کی تفصیل میں طوالت ہے۔ ہم صرف ایک مجادلہ بطورِ مثال ذکر کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کس طرح کے پُرمحبت اصرار و اظہار کو مجادلہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔ حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے قومِ لوط کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے جو مُجادلہ کیا ہے قرآن نے اس کی تعریف فرمائی ہے، تفصیلی صورت کیا تھی۔ قرآن مجید میں صرف اس کی تعریف کی گئی ہے اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے اس وجہ سے ہم اس کی تفصیل تورات سے لے رہے ہیں۔ تورات کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان فرشتوں سے جو قومِ لوط کے لیے عذاب لے کر آئے تھے۔ مندرجہ ذیل گفتگو فرمائی:

"تب ابرہام نے نزدیک جاکر کہا: کیا تُو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تُو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک، بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابرہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا اُن پانچ کی کمی کے سبب سے تُو تمام شہر کو نیست کرے گا؟ اس نے کہا: اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا۔ پھر اس نے اُس سے کہا: شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا: میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا: خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں۔ شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا: اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا دیکھیے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا: میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔

تب اس نے کہا: اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا: میں دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابرہام سے باتیں کرچکا تو چلا گیا اور ابرہام اپنے مکان کو لوٹا۔[1]

یہ طرز کلام، یہ طرز تخاطب، یہ طرز استدلال اور پر محبت اصرار کا یہ انداز ہے جس کو قرآن نے مجادلہ سے تعبیر کیا ہے —— اور یہ مجادلہ ہے جس کی قرآن حکیم نے تعریف فرمائی ہے۔ اگر لوگ اس مجادلہ کو اپنے مناظروں کے جواز کی دلیل ٹھہراتے ہیں تو چاہیے کہ جو روح اس مجادلہ کے اندر ہے وہی روح اپنے مناظروں کے اندر پیدا کریں اور اسی دل سوزی و دردمندی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے سامنے پیش کریں۔ نہ کہ سارا اہتمام تو رزم و پیکار اور جنگ و قتال کا ہو اور نام اس کا رکھ لیا جائے مناظرہ اور اس کے جواز کی دلیل لائی جائے انبیاء کی زندگی سے۔

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک اور مناظرہ بھی نقل کیا ہے، جس کو محاجّہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ مناظرہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے زمانہ کے ایک بادشاہ کے درمیان ہوا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے بادشاہ سے فرمایا کہ "میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جلاتا ہے"۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ "میں مارتا اور جلاتا ہوں"۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ "میرا پروردگار سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال!" اس مناظرہ کو اگر موجودہ فن مناظرہ کے ان اصولوں پر پرکھا جائے جن کی تعلیم ہماری مناظرہ کی کتابوں میں دی جاتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ اچھے مناظر ثابت نہ ہوں گے۔ کیونکہ وہ بادشاہ کے اس قول پر کہ "میں مارتا ہوں اور جلاتا ہوں" بہت کچھ معارضہ کرسکتے تھے جو انہوں نے نہیں

---

[1] پیدائش — باب ۱۸: ۲۳-۳۳

کیا۔ حالانکہ ایک مناظر کی حیثیت سے یہی مقام اُن کے مورچہ لگانے کا تھا، لیکن انہوں نے ایک مناظر کے اصولِ جنگ کے بالکل خلاف اِس نقطہ سے ازخود پسپائی اختیار کی اور جونہی محسوس فرمایا کہ یہ شخص مناظرہ اور اپنی بات کی پچ کرنے پر تل گیا ہے وہ ایک مُسکت بات کہہ کر فوراً علیحدہ ہوگئے۔ جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر داعیٔ حق کو مخاطب کے متعلق یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ بات کو سننا اور سمجھنا نہیں چاہتا، بلکہ معارضہ اور مناظرہ پر اتر آیا ہے تو اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے، بلکہ گفتگو کو ختم کر دینا چاہیے۔

دعوت کی زبان اور داعیانِ حق کا طرزِ کلام

اب ہم بعض باتیں دعوت کی زبان اور انبیاء کے طرزِ کلام سے متعلق بیان کریں گے۔ ایک داعی کا مقصد مجرد ایک حقیقت کو ظاہر کر دینا ہی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جائے تاکہ خواص بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیں اور عوام کے لیے بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہ رہ جائے۔ نیز یہ کہ وہ حقیقت نہایت خوب صورت طریق پر ظاہر ہو تاکہ سننے والوں میں سے جن کے دلوں میں قبولِ حق کی کچھ بھی صلاحیت ہے وہ اسی کو قبول کر لیں اور اعراض کرنے والوں کے اعراض کے لیے ان کی بدذوقی اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کوئی وجہ باقی نہ رہ جائے۔ اس مقصد کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دعوت کی زبان مؤثر اور داعی کا طرزِ کلام فطری اور دل نشین ہو۔ لیکن تاثیر اور کشش پیدا کرنے کے بہت سے مصنوعی اور غیر فطری طریقے بھی ہیں۔ جن سے کلام میں ایک ظاہری کشش اور دل فریبی پیدا کی جا سکتی ہے۔ مثلاً عرب جاہلیت میں کاہن لوگ سجع آرائی اور قافیہ پیمائی سے اپنے کلام میں شان پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خطباء اپنی لفاظی اور آتش بیانی سے اپنے کلام کے زور و اثر کو بڑھاتے تھے۔ شعراء اپنی مبالغہ آرائی اور رندی و ہوس ناکی کی دعوت سے لوگوں کو وجد میں لاتے تھے۔ اسی طرح اس زمانہ میں واعظ اور خطیب شعروں اور قصوں کی مدد سے اپنے کلام میں تاثیر پیدا کرنے کی

کوشش کرتے ہیں، اخبار نویس اور مقررین سیاسی جھوٹ اور مبالغہ سے اپنی دکان چلاتے ہیں، اشتہاری دوافروش جھوٹی قسموں سے اپنا اعتبار بڑھاتے ہیں۔ ان چیزوں سے کلام میں ایک اثر تو ضرور پیدا ہوجایا کرتا ہے، لیکن ان کی حقیقت جھوٹے طمع سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے جو لوگ دنیا میں حق کی دعوت کے لیے اٹھتے ہیں نہ تو یہ بات ان کے شایانِ شان ہے کہ ان مزخرف چیزوں سے اپنی دعوت کی رونق بڑھائیں اور نہ وہ اپنی زبان اور اپنے کلام کو ان چیزوں میں سے کسی چیز سے آلودہ ہی کرتے ہیں۔ ان جھوٹی اور نمائشی چیزوں کی جگہ وہ اس مقصد کے لیے دوسری چیزیں اختیار کرتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ جائز اور صحیح ہیں، بلکہ فطرتِ انسانی کے ساتھ وہ گہری مناسبت بھی رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے ان سے جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ جھوٹے ملمعوں کی طرح ایک ہی رگڑ میں اڑ نہیں جایا کرتا، بلکہ امتحان کی بھٹیوں میں تپنے کے بعد اس کا جوہر اور زیادہ نکھر کے سامنے آتا ہے۔

داعی کے کام کی نوعیت :

یہ بات کہ دعوت کا کام صرف اس طرز کے کلام سے نہیں چل سکتا جو علمی اور خطبی قسم کی بحثوں کے لیے موزوں ہے، اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک داعی کا کام واقعات کی روایات کرنے والے مورخ، قانون کی دفعات مرتب کرنے والے مقنن اور فلسفہ و ریاضی کے مسائل بیان کرنے والے ایک فلسفی اور ماہر ریاضیات سے بالکل مختلف ہے۔ ایک طرف تو اس کا موضوع اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ساری انسانی زندگی اس کے تحت آجاتی ہے، دوسری طرف اس کے مخاطب طبیعت و مزاج کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں اور ذہن و ادراک کے اعتبار سے بھی متفاوت ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے مشن کے ساتھ اس کا لگاؤ بھی اس طرح کا نہیں ہوا کرتا

جس طرح کا لگاؤ ایک مجلسی مضمون نگار کو اپنے مضمون کے ساتھ یا ایک وکیل کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس کے لیے زندگی اور موت کا سودا ہوتا ہے اور اس کی تکمیل کے لیے اسے جی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ ایسی حالت میں نہ تو وہ اتنی بات پر قانع ہی ہو سکتا کہ جو بات اسے کہنی ہے، کسی نہ کسی طرح ایک مرتبہ کہہ ڈالے اور نہ اتنے سے اس کا کام ہی بن سکتا۔ بلکہ لازماً اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جس بات کو بھی کہے ایسی وضاحت و خوبی کے ساتھ کہے کہ اس کا کوئی پہلو بھی گنجلک نہ رہ جائے اور ایسے مؤثر اور دل نشین انداز میں پیش کرے کہ جس دل کے اندر سماعتِ حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی ہو اس میں گھر کر جائے۔ چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی:

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۙ	اے میرے رب! میرے سینے کو میرے
وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۙ وَاحْلُلْ	لیے کھول دے اور میری مہم (یعنی دعوتِ حق) آسان کر
عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۙ یَفْقَهُوْا	اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ
قَوْلِیْ ۪	لوگ میری بات سمجھیں۔

(طٰہٰ - ۲۰ : ۲۵ - ۲۸)

نیز حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے دعا فرمائی کہ ان کو میرے اس کام میں شریک کر دے تاکہ ان کی زبان آوری میرے نقصِ گویائی کی تلافی کر سکے اور یہ دعوت کا کام جو میرے سپرد کیا گیا ہے ناتمام نہ رہ جائے۔

داعیانِ حق کے کلام کی خصوصیات:

اب ہم بالاختصار ان چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے جو انبیاء اور حق کے داعیوں کے کلام کی خصوصیات میں سے ہیں اور جن کو ان کے کلام کی تاثیر میں، ان کی اعلیٰ

سیرت اور پاکیزہ تعلیم کے سوا، ہر چیز سے زیادہ دخل ہے اور جن سے کوئی داعیٔ حق بھی کسی زمانہ میں مستغنی نہیں ہو سکتا۔

پہلی خصوصیت :

سب سے پہلی چیز جو ہمیشہ انبیاء اور حق کے داعیوں کی خصوصیات میں سے رہی ہے، یہ ہے کہ انہوں نے جس قوم کو دعوت دی ہے، اسی کی زبان میں دعوت دی ہے تاکہ قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقے پر اللہ کی حجت پوری ہو سکے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ	اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا اس کی قوم
اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ	کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ ان پر اچھی
لَهُمْ ۭ	طرح واضح کر دے۔

(ابراھیم - ۱۴ : ۴)

جس طرح یہ بات بالکل نظری اور معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر داعیٔ حق کی دعوت کا اصل میدان اس کی اپنی قوم کے اندر ہونا چاہیے اور قوم کو گمراہی میں چھوڑ کر اس کے لیے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو کلمۂ نصیحت سنانے کے لیے خشکی و تری کا سفر کرے، اسی طرح یہ بات بھی بالکل نظری اور معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر داعیٔ حق کو اپنی قوم ہی کی زبان کو اس کے اندر دعوت کا ذریعہ بنانا چاہیے جو لوگ ان باتوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ اصلی حق داروں کی بھی حق تلفی کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتِ کار کو بھی برباد کرتے ہیں اور ان دونوں باتوں کے لیے وہ عنداللہ جواب دہ ہوں گے۔ ہر آدمی جس قوم کے اندر پیدا ہوتا ہے اس قوم کے اندر جس خوبی کے ساتھ وہ کام کر سکتا ہے کسی دوسری قوم کے اندر اس خوبی کے ساتھ نہیں کر سکتا، اور اپنی قوم کی زبان میں اس کی دعوت جتنی مؤثر ہو سکتی ہے کسی اور زبان میں نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے ہر

داعیٔ حق کے لیے صحیح طریق کار یہی ہے کہ وہ اپنی قوم ہی کی زبان کو اپنی دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنائے اور اس بات کی ہرگز پروا نہ کرے کہ کوئی دوسری زبان اس کی اپنی زبان سے زیادہ ترقی یافتہ اور وسیع ہے اور اس میں تقریر کرنا یا مضمون لکھنا زیادہ وسیع حلقہ تک اپنے خیالات کو پہنچانے اور زیادہ عزت و شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ایک داعیٔ حق کے پیش نظر اولین شے یہ نہیں ہونی چاہیے کہ جو دعوت وہ لے کر اٹھا ہے اس کے زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ جانے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔ بلکہ اسے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ جن لوگوں کی ہدایت و خدمت پر وہ خدا اور فطرت کی طرف سے مامور ہے ان کے دلوں میں گھسنے کا سب سے زیادہ مؤثر اور قریبی ذریعہ کیا ہے۔ اگر وہ ذریعہ تنگ اور محدود ہو اور اس کے اختیار کرنے سے اس کی شہرت اور شخصیت کو نقصان پہنچ رہا ہو تو بھی اس کو اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اسی کو اختیار کرنا چاہیے، کیونکہ جو مقصد اس کے پیش نظر ہے اس کے حاصل ہونے کا ذریعہ وہی ہے۔ جس دہقان کی جھولی میں صرف چند بیج ہیں اور ان کو بہرحال وہ اپنے چھوٹے سے کھیت ہی میں بونا چاہتا ہے، اسے ان لوگوں پر رشک نہیں کرنا چاہیے جو نہایت وسیع رقبوں میں تخم ریزی کر رہے ہیں بلکہ جو رقبہ اس کے حصے میں آیا ہے اپنی ساری توجہ اسی پر مرکوز کرنی چاہیے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ ... لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں"[1]

حضرت مسیحؑ کے اس قول پر بعضوں نے نافہمی سے اعتراضات کیے ہیں اور ان پر العیاذ باللہ تنگ نظری کا الزام لگایا ہے، حالانکہ انہوں نے جو بات فرمائی ہے بالکل حقیقت ہے۔ ہر آدمی کے کام کرنے کا ایک فطری دائرہ ہے اور وہ صحیح اور نتیجہ بخش کام

---

[1] انجیل متی۔ باب ۱۵: ۲۴، ۲۶

اسی وقت تک کر سکتا ہے جب تک اپنی جدّ و جُہد کو اس دائرے کے اندر محدود رکھے۔ اگر وہ اس سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے تو گویا وہ اس مغالطہ میں مبتلا ہوتا ہے کہ اب اس کی جدّ و جہد کا میدان پہلے کی نسبت زیادہ وسیع ہو گیا ہے، لیکن حقیقت میں وہ اپنی قوت ضائع کر رہا ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیت:

انبیاء اور داعیوں کے کلام کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان کا کلام، کلامِ مبیّن ہوتا ہے۔ کلامِ مبیّن کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی اس بولی میں گفتگو کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ خوبی اور صفائی کے ساتھ حرفِ مدعا کو قوم کے ہر حلقہ تک پہنچا سکے۔ اس میں نہ اجمال و ابہام ہوتا ہے، نہ غیر ضروری طوالت، نہ استعارات و تشبیہات کی کثرت ہوتی ہے، نہ عقل آزما تلمیحات کی زیادتی، نہ ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے، نہ رکاکت اور ابتذال کا کوئی شائبہ۔ دھلی ہوئی زبان، بے تکلف استعارے، حقیقت کو مجاز کے بھیس میں دکھا دینے والی تشبیہیں اور تمثیلیں۔ علاوہ ازیں غصّہ کے بجائے دل سوزی، سختی کے بجائے نرمی، اور آرائشِ بیان کے بجائے سادگی اور صفائی۔ وہ اپنے وقت کی مختلف طرزوں (سٹائل) میں سے اس طرز کو اختیار کرتے ہیں جو وقار، اثر انگیزی اور وضاحتِ مقصد کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اعلیٰ ہوتی ہے۔ پھر اپنے نفس کی بلندی، اپنے دعوت کی گرمی و دل سوزی اور اپنے علم کی یقین آفرینی اور ایمان بخشی اور سب سے زیادہ اپنے مدعا کو سمجھانے کی گہری خواہش سے اس کو اس قدر ترقی دے دیتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک نیا سٹائل پیدا ہو جاتا ہے جو خود نمونہ اور مثال کا کام دینے لگتا ہے۔ اس سٹائل کی اصل خصوصیت اس کی دل نشینی اور افہام کی صلاحیت ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کی روانی اور سادگی کی وجہ سے اس میں ایسی ادبی

خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے آگے بڑے بڑے ادیبوں کے کلام بالکل بے جان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کے لفظ لفظ سے رس ٹپکتا ہے اور فقرہ فقرہ سے روح کو غذا ملتی ہے۔ اس کی تاثیر سے نہ صرف افراد کی بلکہ قوموں کی زندگیاں بدل جایا کرتی ہیں اور ایک داعیٔ حق کے ہاتھ میں یہ وہ طاقت ہے جس کا مسلح فوجیں بھی مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے، جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اس کے لیے دعائیں کی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں دعوتِ دین کی اس مظلومیت پر ترس آتا ہے کہ یہاں جو حضرات اس فرض کو انجام دے سکتے تھے یعنی علمائے دین وہ ہمیشہ اپنی کج مج بیانی کے لیے بدنام رہے ہیں۔ اوّلاً تو یہ حضرات اس زبان میں لکھنے اور بولنے ہی کو کسرِ شان سمجھتے رہے ہیں جس زبان کو یہاں "لسانِ قوم" کی حیثیت حاصل تھی۔ ثانیاً اگر اس میں انہوں نے لکھنا اور بولنا شروع بھی کیا تو ان کی ایک خاص زبان بن گئی، جو اپنی ثقالت، اپنی خشکی اور اپنی غیر ضروری طوالت یا اپنے مانع فہم اختصار کے لیے مشہور ہے۔ یہاں تک کہ کسی کتاب سے لوگوں کو بدگمان کر دینے کے لیے یہ فقرہ بالکل کافی ہوتا ہے کہ اس کا طرزِ تحریر بالکل "مولویانہ" ہے۔ یہ صورت حال بجائے خود نہایت رنجدہ تھی، لیکن مزید ستم یہ ہوا کہ یہ حضرات تو اپنی "ثقل زبانی" کے لیے بدنام رہے اور جو گروہ مذہب سے بے تعلق یا اس کا مخالف تھا اس نے قوم کی زبان پر قبضہ کر لیا اور اب تک بظاہر اسی کا قبضہ چلا آ رہا ہے۔

تیسری خصوصیت :

انبیاء اور حق کے داعیوں کے کلام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے "ایک مقصد کی طرف ہزار راہوں سے آتے ہیں۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس چیز کو تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ایک مدعا کو مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے سمجھانے کی

کوشش کرنا۔ میر انیس کے الفاظ میں ؎

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

داعی کے کلام میں یہ گونا گونی اس کے اصل مقصد یعنی افہام اور اتمامِ حجت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ جو بات ایک پہلو سے سمجھ میں نہیں آتی وہی بات جب دوسرے پہلو سے سامنے آتی ہے تو اس طرح دل میں اتر جاتی ہے گویا ہمارے ہی دل کی بات تھی۔ آدمیوں کے مذاق اور رجحانِ طبیعت کی طرح ان کے دماغ کے کینڈے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں اور حالات کے اختلاف سے ان کے رخ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جو شخص ان کے دل میں کوئی بات، مسلکِ زندگی کی حیثیت سے اتارنے کا درد رکھتا ہو وہ ان کے کینڈے کے اختلاف اور رخ کی تبدیلی کے لحاظ سے مختلف سمتوں سے ان کے پاس آئے۔ اگر ایک ہی راہ سے اور ایک ہی رنگ میں آئے گا، تو ایک داعی کی حیثیت سے وہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہے گا۔ کیونکہ اس کی یہ یک رنگی اس فطرت کے بالکل خلاف ہے جو اپنے ہر گوشہ میں تنوع پسند اور رنگا رنگ واقع ہوئی ہے۔ جو لوگ داعی کے فرض کی نوعیت اور انسانی فطرت کے ان احوال سے واقف نہیں ہیں ان کے سامنے جب داعیانہ کلام آتا ہے تو وہ اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں کہ اس میں غیر ضروری طوالت ہے، اس میں ایک ہی بات کی تکرار ہے، یہ تھکا دینے والا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ اس بات پر نہیں غور کرتے کہ ایک داعی کا کام ایک آئینہ ساز کے مضمون نگار سے بالکل مختلف ہوا کرتا ہے۔ اُس کے پیشِ نظر صرف چند یک رنگ آدمیوں کے سامنے ہی اپنے خیال کو ظاہر کرنا ہوتا ہے اور اس بے چارے کو مختلف المزاج، مختلف الفطرت اور مختلف الاستعداد دلوں کے اندر اپنی بات اتارنے کے لیے جتن کرنا پڑتا ہے۔ اُس کی کامیابی کے لیے یہ بس ہے کہ اس نے اپنا مافی الضمیر ایک خوب صورت اسلوب سے ادا کر دیا اور اِس کی کامیابی کے لیے یہ شرط ہے کہ دوست دشمن سب

پکار اٹھیں کہ تو نے پہنچانے کا حق ادا کر دیا۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ (الانعام - ۶ : ۱۰۵)

اور اسی طرح ہم اپنی دلیلیں مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں تاکہ ان پر حجت قائم ہو اور تاکہ وہ بول اٹھیں کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اس کو اچھی طرح واضح کر دیں ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں۔

چوتھی خصوصیت :

داعیانِ حق کے کلام کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح وہ حجت و استدلال سے مملو ہوتا ہے اسی طرح جوش اور جذبہ سے بھی لبریز ہوتا ہے۔ وہ خشک فلسفیوں کی طرح صرف عقل ہی کو خطاب نہیں کرتے بلکہ انسان کے اعلیٰ جذبات سے بھی اپیل کرتے ہیں۔ جذبات سے اپیل کرنا کوئی برائی نہیں ہے۔ برائی اگر ہے تو انسان کے حیوانی جذبات سے اپیل کرنا ہے، جس سے اہلِ حق ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں۔ انسان کے اندر اصلی محرک طاقت عقل نہیں ہے، بلکہ جذبات ہیں۔ اس وجہ سے کوئی داعی، جو زندگی کے نظام میں کسی تبدیلی کی دعوت لے کر اٹھا ہو یا پورے نظامِ زندگی کو ڈھا کر اس کو ازسرِنو نئی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہو، بغیر جذبات کو ابھارے اپنے مقصد کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو حضرات اپنی علمی تحقیقات کے نوادر و لطائف بیان کر کے دوسروں کو محظوظ کر دینے اور اپنا جی خوش کر لینے کو مقصودِ زندگی بنائے ہوئے ہوں وہ اس داعیانہ رنگ کو "مدعیانہ" رنگ خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک داعی کے کلام میں جو جوش و جذبہ پایا جاتا ہے وہ ادعار کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے، بلکہ یا تو یہ اس کے اس اعتقادِ راسخ (CONVICTION) کا نتیجہ ہوتا ہے جو

اس کے دل کے اندر جوش مار رہا ہوتا ہے یا اس ہمدردی اور دل سوزی کا اثر ہوتا ہے جس کی آگ اس کے سینہ کے اندر بھڑک رہی ہوتی ہے۔ جو لوگ ایک داعی کی اس خاص حالت سے واقف نہیں ہوتے اور محض قرطاس و قلم کے مشغلہ کے اشتراک کی وجہ سے اسے بھی اپنا ایک ہم پیشہ سمجھے بیٹھے ہوتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ اس کا کلام ان کے کلام کی طرح مردہ اور بے روح نہیں ہے، بلکہ زندہ اور زندگی بخشنے والا ہے تو اس کے جوش کو غرور اور ادعا پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شکل و صورت کے اتحاد کے باوجود سیرتیں مختلف ہوا کرتی ہیں، کچھ ضروری نہیں کہ ہر سفید چیز چربی ہی ہو ؎

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ:

كان رسول الله صلى الله عليه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ
وسلم اذا خطب احمرت	دیتے آنکھیں سرخ ہو جاتیں آواز بھاری
عيناه، وعلا صوته، واشتد	ہو جاتی، جوش تیز ہو جاتا، یہاں تک کہ معلوم
غضبه۔ حتى كأنه	ہوتا کہ آپ کسی دشمن فوج کے آپڑنے کے
منذر جيش، يقول:	خطرے سے آگاہ کر رہے ہیں، فرماتے:
صبحكم ومساكم!	وہ تم پر صبح کو آپڑے یا شام کو!

ظاہر ہے کہ آپ کے کلام میں یہ گرمی آپ کے یقین اور قوم کے ساتھ ہمدردی کے جذبے سے پیدا ہوتی تھی اور ہر سچے داعی پر اس طرح کی حالت طاری ہو سکتی ہے۔

صحیح مسلم، کتاب الجمعۃ، باب تخفیف الصلوٰۃ والخطبۃ۔

اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ بالکل نمائشی طور پر بھی جوش و جذبہ کا اظہار کیا کرتے ہیں؛ بلکہ بسا اوقات دعاوی اور شطحات پر بھی اتر آتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر شخص ایسا ہی ہو۔ جو لوگ جھوٹے ہوتے ہیں وہ زیادہ دنوں تک اپنے جھوٹ کو چھپا نہیں سکتے۔ زمانہ کھرے کھوٹے میں امتیاز کر ہی لیتا ہے۔ کوا نمائشی پر لگا کر کب تک طاؤس بنا پھرے گا۔

پانچویں خصوصیت:

پانچویں خصوصیت ان کے کلام کی یک رنگی اور وحدتِ مقصد ہے۔ وہ اپنے ترکش کا ہر تیر ایک ہی نشانہ پر مارتے ہیں۔ پیشہ ور مضمون نگاروں اور مقرروں کی طرح ان کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ ان سے جس پلیٹ فارم پر چاہیں تقریر کرا لیں، جس عنوان پر چاہیں مضمون لکھا لیں اور جس جلسہ کی چاہیں صدارت کرا لیں۔ وہ اپنے لفظ لفظ اور فقرہ فقرہ کو اللہ کی دی ہوئی امانت سمجھتے ہیں اور اس کے خاص مصرف کے سوا کہیں اور اس کو ضائع نہیں کرتے۔ آپ ان کی ہر تحریر و تقریر میں ایک ہی صدا پائیں گے۔ دوسرے موضوع کتنے ہی دل فریب کیوں نہ ہوں، ان پر تقریر و تحریر سے کتنی ہی بڑی عزت و شہرت کیوں نہ حاصل ہو رہی ہو، بظاہر ان میں دینی و ملی فوائد کا کوئی پہلو بھی کیوں نہ نظر آ رہا ہو، لیکن وہ کسی غیر متعلق یا ضمنی چیز پر اپنی زبان اور اپنے قلم کی قوت صرف نہیں کرتے۔ اس چیز کو قرآن نے 'فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ' (الشعرآء-۲۶: ۲۲۵) ہر وادی میں بھٹکنے سے تعبیر کیا ہے اور انبیاء اور صلحاء کو اس سے بری قرار دیا ہے۔ اس دنیا کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں برا یا بھلا، کوئی انقلاب اگر پیدا ہوا ہے تو انھی لوگوں کے زبان و قلم سے ہوا ہے جنھوں نے اپنی ساری قوت کسی متعین ہدف پر صرف کی ہے، یوں ہی ہوا میں ہوائی تیر نہیں چھینکتے رہے ہیں۔

چھٹی خصوصیت :

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام کو ہر اس چیز سے پاک رکھتے ہیں جو مخاطب کے اندر ضد اور مخالفت کا جذبہ پیدا کرے، کیونکہ یہ چیز ان کے مقصد کے بالکل خلاف ہے۔ مثلاً مخاطب سے گفتگو کے وقت نہ تو اپنی برتری کا اظہار کریں گے، نہ اس کی غلط زندگی پر باندازِ استخفاف تنقید کریں گے، بلکہ جو کچھ کہیں گے نرمی اور ہمدردی کے ساتھ کہیں گے :

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (طٰہٰ - ۲۰ : ۴۳-۴۴)	تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

اسی طرح وہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالتے جس سے مخاطب کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔ دلائل سے اس کے غلط مزعومات کی پرزور تردید تو کرتے ہیں، لیکن خواہ مخواہ تحقیر الفاظ استعمال کر کے اپنے مقصد کو اپنے ہی ہاتھوں نقصان نہیں پہنچاتے :

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ (الانعام - ۶ : ۱۰۸)	اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

مخاطب کی ترش کلامی اور بدسلوکی کا جواب بھی شیریں کلامی سے دیتے ہیں، کیونکہ ایک

داعیٔ حق کے لیے دلوں کے اندر راہ پانے کا طریقہ یہی ہے :

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ	اور بھلائی اور برائی ، دونوں یکساں نہیں
ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ	ہیں۔ تم برائی کو اس چیز سے دفع کرو جو
فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ	زیادہ بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی، جس کے
عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ	اور تمہارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ
وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ	ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔ اور یہ دولت
صَبَرُوا وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا	نہیں ملتی مگر انہی لوگوں کو جو ثابت قدم رہنے
ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ وَإِمَّا	والے ہوتے ہیں اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی
يَنزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ	مگر انہی کو جو بڑے نصیبہ ور ہوتے ہیں!
نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ إِنَّهُ	اور اگر شیطان تمہارے دل میں کوئی اکساہٹ
هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝	پیدا کرہی دے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈو بے شک
(حٰمٓ السجدۃ - ۴۱ : ۳۴-۳۶)	حقیقی سننے والا جاننے والا وہی ہے۔

مناظرانہ انداز کلام سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر مخاطب کے متعلق اندازہ ہو جائے کہ وہ مناظرہ پر اتر آیا ہے تو داعیٔ حق سلام کر کے وہاں سے چل دیتا ہے، کیونکہ مناظرہ بازی اور دعوت حق میں تضاد ہے :

فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ	تو وہ اس معاملے میں تم سے نزاع
وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ	کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف
لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ وَ	بلاتے رہو۔ بے شک تم ہی سیدھی راہ پر
إِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ	ہو۔ اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو
بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ اللَّهُ يَحْكُمُ	کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے
بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا	ہو۔ اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان

كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۔ قیامت کے دن اس چیز کا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو۔
(الحج - ۲۲ : ۶۷-۶۹)

مناظرہ اگر کرتے بھی ہیں تو نہایت بہتر طریق پر یعنی اپنے اور مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کر کے، ان کے لوازم و نتائج کی دعوت دیتے ہیں:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۔
(العنکبوت - ۲۹ : ۴۶)

اور اہلِ کتاب سے نہ بحث کرو مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے، بجز ان کے جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔

ساتویں خصوصیت:

داعیٔ حق کے کلام کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ لفظ اور معنی، طول اور اختصار، انداز بیان اور لب و لہجہ میں سننے والے کی نفسیات کا پورا لحاظ رکھتا ہے۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوشخبری دو اور لوگوں میں نفرت نہ پیدا کرو۔

اسی طرح آپ نے تاکید فرمائی کہ جب نصیحت کرو تو مختصر کرو۔

خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانش مندی کی علامت قرار دیا:

يقول: ان طول صلاة الرجل، و قصر خطبته فرماتے تھے: آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی سوجھ بوجھ کی

مئنة من فقهه فاطيلوا الصلاة واقصروا الخطبة. وان من البيان سحرا[1]

علامت ہے۔ تو نماز لمبی کرو اور خطبہ مختصر کرو اور بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔

اگر مخاطب کم فہم ہو یا بات باریک ہو تو بات کو دہرا دینا چاہیے تاکہ سننے والا اچھی طرح سن سکے اور اس کو سمجھ سکے:

عن انس عن النبي صلى الله عليه وسلم انه كان اذا تكلم بكلمة اعادها ثلاثا حتى تفهم عنه[2]

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات فرماتے تھے تو اسے تین بار دہراتے تھے تاکہ خوب سمجھ میں آجائے۔

---

1. صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة
2. صحیح البخاری، کتاب العلم، باب ۳۰

انبیائے کرام کا طرزِ استدلال

حضرات انبیائے کرام اور داعیانِ حق جس مقصد کو لے اٹھتے ہیں وہ ایمان کی دعوت ہے۔ ایمان کوئی منفی چیز نہیں ہے، بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اس کا اصلی فائدہ صرف اس صورت میں حاصل ہوتا ہے جب یہ پوری طرح دل میں راسخ ہو۔ یہ استحکام و رسوخ پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد نہایت پائدار اور محکم استدلال پر ہو۔ اس کے بغیر نہ تو یہ ایمان زندگی کے لیے ایک محرک کا کام دے سکتا، نہ اس سے دین کی تمام اعتقادی و عملی جزئیات وجود میں آسکتیں اور نہ یہ زندگی کے وسیع الاطراف گوشوں میں انسان کی نگرانی کرسکتا۔ اس وجہ سے داعیانِ حق کا کام نہ مجرّد تحکّم سے چل سکتا، نہ مغالطہ دے کر وہ اپنا مقصد حاصل کرسکتے، نہ الزامی قسم کے دلائل ان کے کام آسکتے، نہ محض شاعرانہ اور خطیبانہ قسم کا استدلال، جو فطرت اور عقل کے اندر اپنی کوئی اساس نہ رکھتا ہو، ان کے مقصد کو پورا کرسکتا۔ اس طرح کے مجادلانہ اور الزامی و خطابی طرزِ استدلال سے وہ لوگ تو بے شک اپنا کام چلا لے جاتے ہیں جن کے پیشِ نظر صرف مخاطب کو ساکت کردینا یا اس کو مغالطہ میں ڈال کر اپنا کوئی مقصد حاصل کرلینا ہو۔ لیکن جن کے سامنے مخاطب کو چپ کرانا نہیں، بلکہ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو صحیح راہ پر چلنے کے لیے بیدار کرنا ہو، اور جن

کا مقصد لوگوں کو مسحور یا مرعوب کر کے کسی راہ پر ہانک دینا نہیں، بلکہ ان کی فطرت اور عقل کو اس طرح جگا دینا ہو کہ مشکل سے مشکل راہوں میں ہر شخص خود اپنی رہنمائی کر سکے، وہ اوّلاً تو استدلال کی ان قسموں کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگاتے اور اگر لگاتے بھی ہیں تو اس امر کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے ہیں کہ ایک پاک اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وسائل و ذرائع بھی نہایت پاک اور اعلیٰ ہوں۔ اس چیز نے انبیائے کرام اور داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کو دوسروں کے طرزِ استدلال سے بالکل ممیز کر دیا ہے جس کی بعض نمایاں خصوصیات کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

استدلال کی عمومیت :

استدلال ہوا اور پانی کی طرح ایک ضرورت کی چیز ہے۔ ہر انسان زندگی کو صحیح طور پر بسر کرنے کے لیے ایمان کا محتاج ہے اور محکم ایمان بغیر محکم استدلال کے حاصل نہیں ہو سکتا، اس وجہ سے استدلال کے لیے دو باتیں ضروری ہوئیں۔ پہلی یہ کہ استدلال کا طریقہ اتنا فطری اور سادہ ہو کہ ہر شخص جس طرح اپنی ضرورت کے مطابق زمین اور فضا کے ذخیرۂ آب و ہوا سے ہوا اور پانی حاصل کر لیتا ہے اور اس میں اس کو کوئی خاص دقت نہیں پیش آتی، اسی طرح ہر شخص زمین و آسمان کے آثار و آیات سے اپنے اطمینانِ قلب کے لیے جس قدر چاہے دلیلیں پیدا کر لے اور اس میں اس کو تفکر اور تذکر کے سوا کسی اور چیز کا اہتمام نہ کرنا پڑے۔ دوسری یہ کہ جس طرح انسان کی جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے کہ جس پانی کو وہ پی رہا ہے وہ صاف ہو اور جس ہوا میں سانس لے رہا ہے وہ تازہ ہو، اسی طرح اس کی عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس استدلال سے اصولِ زندگی حاصل کر رہا ہے وہ بالکل بے آمیز، بالکل خالص اور

بالکل پاک ہو۔ ان دونوں باتوں کو حاصل کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام اور داعیانِ حق کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے ایک طرف تو استدلال و حجت کے ان مصنوعی طریقوں سے ہٹ کر اپنی راہ نکالی ہے جو کسی قوم میں علمی و فنی ترقیوں سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں اور ایک خاص پیشہ ور گروہ کے سوا دوسرے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ دوسری طرف اس تمام مواد کا انہوں نے جائزہ لیا ہے۔ جو استدلال و حجت کے لیے کام میں لایا جاتا رہا ہے اور اس میں سے چھانٹ کر صرف اس چیز کو وہ حجت و استدلال کے لیے کام میں لاتے ہیں جو ہر قسم کی غیر فطری ملاوٹ سے پاک ثابت ہوا ہے۔ اس طرزِ استدلال کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کا ایک انبوہِ عظیم جو اس سے پہلے بالکل اندھا بہرہ بنا ہوا گنتی کے چند انسانوں کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے دفعتہً خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے لگتا ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک سڑے گلے موادِ استدلال کے نکلتے رہنے کی وجہ سے دلوں اور روحوں پر جو مُردنی طاری تھی اس صالح موادِ استدلال کے چند لقمے حلق سے اترتے ہی دفعتہً دور ہو جاتی ہے اور کھانے والا اپنے آپ کو بالکل تازہ دم اور چاق و چوبند محسوس کرنے لگتا ہے۔

داعیانِ حق اور انبیائے کرام کے طرزِ استدلال کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عقلِ انسانی ان کے زمانے میں کروٹ لیتی ہے اور ایک عام ذہنی بیداری ہر گوشہ میں نمودار ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ان گوشوں میں بھی ایک حرکت پیدا ہو جایا کرتی ہے جہاں سے کسی اچھی خبر کی کسی کو بھی امید نہیں ہوتی۔ ہر طرف تنقید کی نگاہیں کھل جاتی ہیں۔ ہر آنکھ دیکھنے اور ہر زبان بولنے لگتی ہے۔ فکر و استدلال کے پرانے طریقے، جو اب تک نہایت محبوب چلے آ رہے ہیں، فرسودہ اور دقیانوسی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ بہت سے نظریات جنہوں نے وحی و الہام کا درجہ حاصل کر رکھا تھا بالکل بے مصرف اور

بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ یہ ذہنی انقلاب ان لوگوں پر بہت گراں گزرا کرتا ہے جو اپنی قدیم محبوبات و مالوفات کو حق سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس میں مزاحمت پیدا کریں، لیکن نہ تو اس چیز کو روکا جا سکتا، نہ اس کو کچلنا صحیح ہے۔ البتہ جس چیز کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ یہ چیز ہے کہ جو ذہنی آزادی پیدا ہو رہی ہے اس کا بہاؤ صحیح رخ پر ہو، اس میں بے اعتدالی اور مطلق العنانی نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ اس فرض سے داعیانِ حق خود اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں اور وہ اس بات کی پوری نگرانی کرتے ہیں کہ جو فکری آزادی وہ لوگوں کو دے رہے ہیں وہ ان کے لیے نجات کا ذریعہ ہو، ہلاکت کا سبب نہ بنے۔

مخاطب کے اندر فکرِ صالح کی تخم ریزی :

انبیاء اور اہلِ حق کے طرزِ استدلال کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف دلیل نہیں دیتے، بلکہ مخاطب میں استدلال کرنے کی قابلیت بھی پیدا کرتے ہیں کہ وہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں جس ہمہ گیر انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں وہ انقلاب اس وقت تک پائدار بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا جب تک وہ انسان کی فکری و نظری صلاحیتوں کو پوری طرح جگا نہ دیں۔ زندگی کوئی مفرد اور بسیط چیز نہیں ہے کہ اس کو صحیح طور پر گزار دینے کے لیے چند گنے چنے اصولوں کی رہنمائی کافی ہو سکے۔ یہ گوناگوں ظاہری و باطنی مطالبات و مقتضیات کا مجموعہ، بے شمار انفرادی و اجتماعی روابط و علائق کا شیرازہ، ان گنت شخصی، عائلی اور قومی حقوق و فرائض کا ایک گنجینہ ہے۔ پھر وہ پوری کی پوری ہماری نظروں کے سامنے موجود بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کی گرفت میں آ سکے اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں اس کی ہر حالت کے لیے پہلے سے ایک حکم متعین ہو سکے، بلکہ اس کا ماضی اور مستقبل دونوں غیب کے پردوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ صرف تھوڑا سا حاضر ہے جس کے اشارات کی

روشنی میں اس کے ماضی کو بھی سمجھنا پڑتا ہے اور اسی کی رہنمائی سے اس کے مستقبل کو بھی معین کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں زندگی کی رہنمائی کے لیے قانون دائمی کے صرف متعین و محدود ضابطے کافی نہیں ہو سکتے، بلکہ ضروری ہے کہ اس ضابطہ کے ساتھ انسان کے اندر فکرِ صالح کی ایک ایسی کبھی نہ بجھنے والی روشنی بھی ہو جو زندگی کے ان مخفی گوشوں میں بھی اس کی رہنمائی کر سکے جن میں رہنمائی کے لیے اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہو۔ یہ فکرِ صالح انبیاء اور اہلِ حق کے طرزِ استدلال سے خود بخود مخاطب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ انبیاء جب اپنی اصولی تعلیمات کا آغاز کرتے ہیں تو اس کی طرح ہی اس طرح ڈالتے ہیں کہ اس تخمِ صالح کی تخم ریزی کے لیے خود بخود دلوں اور روحوں کے اندر زمین بھی ہموار ہو جاتی ہے اور اس کے بیج بھی پڑ جایا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو ایک طرف شریعت کا ایک شاداب باغ تیار موجود ہوتا ہے جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور دوسری طرف حکمت کا ایک لہلہاتا ہوا چمن بھی وہ ہر قلبِ صالح کے اندر اگا دیتے ہیں جو اگرچہ نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا، لیکن اس کی بہار ہمیشہ قائم اور اس کی شاخیں ہر موسم میں ثمر بار رہتی ہیں۔ بظاہر تو اس کی حیثیت انبیاء کی اصل تعلیم کے مقابل میں ایک ضمنی کاشت اور ضمنی پیداوار کی ہے، لیکن اپنی قدر و قیمت اور اپنے بیش بہا فائدہ کے اعتبار سے یہ اصل کے برابر جگہ پاتی ہے یہی چیز ہے جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے مثل اس کے ساتھ ایک اور چیز۔ اسی شجرِ مبارک کے پھل پھول ہیں جو ہمیں احادیث کی صورت میں ملے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ جس کو یہ چیز ملی اس کو خیرِ کثیر کا خزانہ ملا۔ اسی کی نسبت قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ صرف نصیبہ ور لوگ ہی ہیں جن کو یہ چیز ملتی ہے۔ اور اسی کو بعض احادیث میں ایسے خزانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

منطقی طرزِ استدلال :

یہ تخلیقی صفت صرف اہلِ حق اور حضرات انبیائے کرام کے طرزِ استدلال کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی مناظر و متکلم کے استدلال میں یہ چیز آپ کو نہیں مل سکتی۔ ہمارے علماء منطقی طرزِ استدلال کو بڑی اہمیت دیتے رہتے ہیں، لیکن منطقی طرزِ استدلال اس پہلو سے سب سے زیادہ ناقص ہے۔ منطق کو زیادہ سے زیادہ جو عزت دی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک استدلال کو اپنی کسوٹی پر جانچ کر وہ بتا سکتی ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں۔ استدلال کی قابلیت پیدا کرنا اس کے بس سے باہر ہے اور یہ کام بھی منطق سے صرف ایک خاص حد تک ہی لیا جاسکتا ہے۔ قرآن میں اور انبیائے کرام کے کلام میں ہم کو استدلال کی ایسی نازک قسمیں بھی ملتی ہیں جن کو منطق کی ترازو پر سرے سے تولا ہی نہیں جاسکتا۔ لیکن ہمارے متکلمین، جنہوں نے منطق کو اس کی حیثیت سے زیادہ درجہ دیا، نے کوشش تولنے کی اسی ترازو سے قرآن کی ان اشرفیوں کو بھی تولنا چاہا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اشرفیوں کو کوئلوں سے بھی کم تر قرار دے بیٹھے۔

باقی رہے اہلِ فلسفہ تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ فکرِ انسانی کو اس بات کی تربیت ضرور دیتے ہیں کہ وہ استدلال و استنباط کے مختلف میدانوں میں جولانی کرسکے۔ لیکن انہوں نے اپنے موادِ استدلال، اپنے طرزِ استدلال اور اپنے ذرائع استدلال، تینوں کو رطب و یابس کا مجموعہ بنا دیا ہے جس کی وجہ سے ان کے طریقے پر سوچنے والا انسان حیرانی و سرگشتگی کے سوا کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ ان کی رہنمائی میں اگر انسان چند قدم صحیح راہ میں اٹھاتا ہے تو ساتھ ہی مجبور ہوتا ہے کہ چند قدم غلط سمت میں بھی اٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی مختلف وادیوں کی آوارہ گردی اور اٹکل کے تیر تکے چلانے میں گزر جاتی ہے اور چند متناقض و متضاد الجھے ہوئے افکار کے سوا اس کے

پڑے کچھ نہیں پڑتا۔ اس معاملہ میں فلسفۂ قدیم ہو یا فلسفۂ جدید، سب کا حال یکساں ہے۔ سب کے اصولِ فکر میں الجھاؤ اور ہر ایک کے نتائجِ فکر میں پریشانی ہے اور اب تو جب سے سائنس کی ترقیوں نے سارا مدار تجربہ و مشاہدہ پر قائم کر دیا ہے اور انسان اس خبط میں مبتلا ہو گیا ہے کہ وہ کوئی چیز بھی بغیر سر کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے نہیں مانے گا سرے سے توقع ہی اس بات کی نہیں رہ گئی ہے کہ اس کا ایک قدم بھی جادۂ مستقیم پر پڑے گا۔ اب تک فلسفہ کی بنیاد جن اصولوں پر تھی ان میں سے اگر بعض غلط تھے تو بعض صحیح بھی تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے خوابہائے پریشاں میں سے بعض سچے بھی نکل آتے تھے اور آدمی کے لیے صرف سچے اور جھوٹے میں امتیاز کی مشکل تھی۔ لیکن اب تو سارا تکیہ حس و مشاہدہ پر رہ گیا ہے اور حس و مشاہدہ کی جہانگیری معلوم ہے کہ وہ کہاں تک ہے۔ اس مادی فلسفہ کے علاوہ آج اگر کوئی چیز فلسفہ کے نام سے موجود ہے تو وہ اہلِ تشکیک کا فلسفہ ہے جس کی ساری بنیاد حواس و عقل کی بے اعتباری پر قائم ہے اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی فلسفہ نہیں، بلکہ تمام علم و فلسفہ کی کلی نفی ہے اور دنیا کو حیرانی کے سوا اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرات انبیائے کرام کا طریقہ استدلال نہ اہلِ منطق کے طریقہ کی طرح بانجھ ہے اور نہ اہلِ فلسفہ کے طریقہ کی طرح پریشان کن۔ بلکہ وہ فکرِ انسانی کی اس طرح تربیت کرتے ہیں کہ وہ خود بخود صحیح راہ پر چلنے لگے اور منزلِ مقصود کا سراغ اس کے اندر یقین پیدا کر دے کہ اس نے جو راہ اختیار کی ہے وہ صحیح ہے۔ وہ پہلے تو ماخذ استدلال کی طرف توجہ دلاتے ہیں، یعنی آفاق و انفس کی طرف۔ آفاق سے مراد نظامِ کائنات کے وہ آثار و آیات اور قوانین و ضوابط ہیں جو اس دنیا میں ہر شخص کو بادنیٰ توجہ نظر آتے ہیں۔ انفس سے مراد وہ قوتیں اور قابلیتیں اور وہ یقینیات ہیں جن کو ہر انسان اپنے اندر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ ان میں سے نمایاں چیزوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں اور ان سے جو باتیں لازم آتی ہیں

ان کو پیش کرتے ہیں۔ یہ پیش کرنا کبھی تو ایسی تصریح کے ساتھ ہوتا ہے کہ پوری بات بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے اور کبھی تربیت کے خیال سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ لازمی نتیجہ کی طرف صرف اشارہ کر دیا جاتا ہے تاکہ مخاطب خود اس نتیجہ تک پہنچے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں صحیح نتائج نکالنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے جو زندگی کے سفر میں، ہر مرحلہ میں، اس کے کام آتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو دوسرے کی بات سمجھ کر اس کی تردید یا انکار کے درپے نہیں ہوتا، بلکہ اس کو خود اپنا نتیجۂ فکر سمجھ کر اس کو قبول کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔ تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح مخاطب و متکلم میں استاد و شاگرد کے بجائے باہم دگر رفیق کی نسبت پیدا ہو جاتی ہے اور مخاطب میں یہ احساس کمتری نہیں پیدا ہوتا کہ میں اس نتیجہ تک دوسرے کی انگلیاں پکڑ کے پہنچا ہوں، بلکہ وہ یہ خیال کرتا ہے کہ ہم دونوں مشترک طور پر اس نتیجہ تک پہنچے ہیں۔ یہ باتیں مقصدِ دعوت کو اتنے مختلف پہلوؤں سے فائدہ پہنچاتی ہیں کہ ان کی تفصیل کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں ہے کہ استدلال کی ساری قسموں میں فطرتِ انسانی سے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی قسم یہی لوازم سے استدلال کی قسم ہے۔ اس وجہ سے اہلِ حق اور حضرات انبیائے کرام نے اس کو سب سے زیادہ برتا ہے۔ آدمی جب ایک امر کا آفاق میں مشاہدہ کرتا ہے یا اپنی فطرت کے اندر اس کا یقین محسوس کرتا ہے تو جو باتیں اس سے لازم آتی ہیں ان کا انکار نہیں کر سکتا، بشرطیکہ وہ صحیح ترتیب کے ساتھ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔ اگر انکار کرے گا تو محض زبان سے انکار کرے گا، اس کا دل اس کے اس انکار کا ساتھ نہ دے گا اور اس انکار پر اس کے لیے زیادہ دنوں تک جمے رہنا صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم ہو۔ ایک امر کے لوازم کی حیثیت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوا کرتی ہے اور ہر آدمی سے، جس میں حق پرستی

اور سچائی کی کوئی رمق باقی ہے، توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس بات پر مجملاً ایمان رکھتا ہے اس کی تفصیلات اور لوازم کو تسلیم کرنے سے بھی وہ گریز نہ کرے گا۔ جن لوگوں نے قرآن مجید کے دلائل پر غور کیا ہے وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کے بیشتر دلائل کی نوعیت یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو شخص قرآن، اپنے دل کو ہر طرح کے تعصبات سے پاک کر کے پڑھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی صحیفۂ دل کی تلاوت کر رہا ہے اور اس کی ہر صدا اسے اپنے ہی ضمیر و دل کی آواز کی طرح مانوس معلوم ہونے لگتی ہے۔

غلط مسلّمات پر بنیاد رکھنے سے احتراز:

اہلِ حق اور انبیائے کرام کے طرزِ استدلال کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ علم اہلِ مناظرہ کی طرح مخاطب کے کسی غلط مسلّمہ کو بنائے استدلال نہیں بناتے۔ اگر ایک شخص ایک غلط بات کو مان رہا ہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے، نہ کہ اس کی غلطی کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ چند اور غلطیوں کو بھی تسلیم کرے۔ جو لوگ اپنے مخاطب کو صرف خاموش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں، یا اس کو اپنی بات کے آگے جھکانا چاہتے ہیں، یا اس کو کسی مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، ان کے استدلالی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیت اسی چیز کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اہلِ حق اس چیز سے اس قدر گریز کرتے ہیں کہ اگر مخاطب کے کسی غلط مسلّمہ پر اپنے کسی حق کو بھی ثابت کر سکتے ہوں، جب بھی وہ ایسا نہیں کرتے۔ ان کی نظروں میں اس حق کی کوئی وقعت نہیں ہے، جس کی بنیاد کسی باطل پر ہو۔ اس طرح کا کھوٹ کھلا اور بے اساس حق مناظرہ کی مجلسوں میں ممکن ہے کچھ دیر کے لیے اپنی چمک دمک دکھا دے لیکن زندگی کی مہمات میں یہ کچھ کام نہیں دیتا۔ زندگی کی مہمات میں صرف وہ حق کام دیتا ہے جس کی جڑیں فطرتِ انسانی کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہوں اور اس کی دستگیوں کا یہ حال

ہو کر تمام فضا اس کے برگ و بار میں چھپ جائے۔ ہمارے متکلمین نے بالعموم یہ غلطی کی ہے کہ اسلام کے کسی اصول کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے جب وہ اپنی کوئی بنیاد نہ قائم کر سکے تو انہوں نے دوسروں ہی کے کسی نظریہ اور واہمہ کو اساس بنا کر اسی پر اپنے مزعومات کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس طرح کی غلط وکالت سے اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اس قدر اسلام کے مخالفین کی مخالفتوں سے اس کو نہیں پہنچا۔ اسلام کے کسی اصول کو صحیح عقلی و فطری دلائل سے نہ ثابت کر سکنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ خدانخواستہ اسلام اپنے اصولوں کی سچائی کے عقلی و فطری دلائل رکھتا ہی نہیں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ حضرات فیرفطری عقلیات سے اپنا مذاق اس قدر بگاڑ چکے تھے کہ اسلام کی عقلیت کی قدر و قیمت کو یہ پہچان ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے صحیح راہ یہ تھی کہ خواہ مخواہ کو اسلام کی وکالت کا بیڑا نہ اٹھاتے، بلکہ اپنے جن دھندوں میں مشغول تھے انہیں میں مشغول رہتے۔ لیکن دین آبا رہونے کی حیثیت سے اسلام کے لیے ان کے دلوں میں جو عصبیت تھی وہ انہیں اکساتی تھی کہ وہ جس دین کا نام لیتے ہیں عقلی اصولوں پر اس کی سچائی بھی ثابت کریں۔ اسلام کی عقلیت ان کے فسادِ مذاق اور قرآن سے محرومی کی وجہ سے اُن کے دلوں کو اپیل نہیں کرتی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے چاہا کہ اس کو اسی عقلیت کے معیار پر پورا ثابت کر دکھائیں جو ان کے زمانوں میں مقبولِ عام و خاص ہے۔ ان کی اس غلط کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی محکم اور سچی تعلیمات کی ساری عمارت اس کی اپنی چٹان سے زیادہ مضبوط بنیادوں سے ہٹا کر بالکل کمزور اور پوچ بنیادوں پر کھڑی کر دی گئی۔ ان حضرات نے یہ کوشش کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو، لیکن اس کے نتائج نہایت خطرناک نکلے۔ زمانہ کے استدلال اور سائنس کے اکتشافات جب وہ نظریات بے حقیقت ثابت کر دیے جو کل تک مقبولِ عام تھے تو اس کی زد لازماً اسلام کے ان اصولوں پر بھی پڑی جن کو ان غلط نظریات پر ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس

کے سبب سے اسلام کے متعلق بہتوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوگیا کہ جس طرح وہ نظریات پرانے ہوگئے اسی طرح اسلام بھی پرانا ہوگیا۔ یہ سوئے ظن پیدا کرنے میں جس طرح ہمارے پرانے متکلمین نے حصہ لیا ہے اسی طرح ہمارے نئے متکلمین نے بھی اس میں حصہ لیا ہے اور ان دونوں گروہوں کی مشترک غلطی یہی ہے کہ حق کی حمایت کے لیے انہوں نے حق کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ اس کے لیے باطل کا تعاون ضروری سمجھا۔ حالانکہ حق کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ ثابت اور محکم ہے اور عقل و فطرت کے اندر اس کی جڑیں نہایت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے بتائے ہوئے طریقۂ فکر و استدلال کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ وہ قرآنی طرزِ استدلال کی باریکیوں اور خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حالانکہ اگر وہ استدلال کی ان خلافِ فطرت روشوں کو چھوڑ کر قرآن اور پیغمبر کے حکیمانہ طرزِ استدلال کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ قرآن کے ہر دعوے کی بنیاد ایسے محکم دلائل پر قائم ہے جو زمان و مکان کی تمام قیود و حدود اور انقلابِ آثار و افکار کی تمام اثر اندازیوں سے بالکل آزاد ہیں۔

قدرِ مشترک کی تلاش :

داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اور اپنے مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کر کے اس کو بنائے بحث و استدلال بناتے ہیں، ہر گوشہ میں خواہ مخواہ اپنی انفرادیت اور یکتائی کے اظہار کی کوشش نہیں کرتے۔ نوعِ انسانی اپنے ظاہری اختلافات کے لحاظ سے کتنی ہی متفرق اور پراگندہ کیوں نہ نظر آئے، لیکن اس کے اس تفرق اور پراگندگی کی تہ میں بے شمار اصول و عقائد ایسے بھی ہیں جن میں سب متحد ہیں۔ آفاق کے قوانین و ضوابط، تاریخ کے مسلمات، فطرت کے یقینیات اور بنیادی اخلاقیات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں شرق و غرب اور عرب و عجم، سب ایک ہی نقطۂ نظر

رکھتے ہیں۔ اگر ان کو بحث و استدلال کی اساس قرار دے کر اس بات کی سعی کی جائے کہ منطقی طور پر ان اصولوں سے جو باتیں لازم آتی ہیں لوگ ان میں بھی متفق اللفظ ہو جائیں تو یہ بات ان لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو نیک نیت اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں۔ زندگی کے جو اصول مشترک ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے لوازم میں جو اختلاف ہوا کرتا ہے وہ اکثر سوئے فہم اور تقلید سے پیدا ہوا کرتا ہے اور کوشش کر کے اگر اس کو دور کر دیا جائے تو ہر شخص ان اصولوں کو مشترک ورثہ ہی کی حیثیت سے قدر و عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔ حضرات انبیائے کرام نے ہمیشہ یہی طریقہ استدلال و حجت کے لیے اختیار کیا ہے۔ عرب کے مشرکین اور اہل کتاب پر جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمام حجت فرمایا ہے اس کی تمام تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے کہیں یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ اُن سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو اُن کے لیے بالکل نادر اور انوکھی ہو اور اُن کی تاریخ، اُن کی روایات، اُن کے معروف و متداول اُن کے عقائد و اخلاق میں اس کی اصل موجود نہ ہو۔ اختلاف جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اصول کی تعبیر اور اُن کے لوازم و نتائج میں نظر آتا ہے اور اسی کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ تھا کہ اصول و جزئیات میں جو تناقض پیدا ہو گیا ہے لوگ اس کو دور کر لیں اگر وہ بات حق ہے جو قرآن مجید کہہ رہا ہے تو اس کو مان لیں۔ اور اگر وہ بات حق ہے جس کے وہ مدعی ہیں تو اس کو صحیح ثابت کر دیں۔ اس طرز استدلال کا فائدہ یہ ہے کہ داعی کے متعلق یہ بدگمانی نہیں پیدا ہوتی کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو اپنی انفرادیت کے زعم میں تمام ماضی پر خط نسخ پھیرنا چاہتا ہے اور اپنی شخصیت کا سکہ جمانے کے خبط میں مبتلا ہے۔ بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی اگلوں کا ورثہ ہماری طرف منتقل کرنے آیا ہے اور اگر کچھ لوگ شرارت کی وجہ سے بدگمانیاں پھیلانا بھی چاہتے ہیں تو زیادہ عرصے تک نہیں پھیلا سکتے۔ اصل حقیقت کا آفتاب نمودار ہو کر بہت جلد ان ظلمتوں کو کافور کر دیتا ہے۔

جو لوگ اہلِ حق کے اس طرزِ استدلال کی خوبیوں اور فوائد سے واقف نہیں ہیں ان کا طرزِ عمل بالعموم اس کے بالکل ضد ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ قدرِ مشترک تلاش نہیں کرتے بلکہ جو قدرِ مشترک انہیں ملتا بھی ہے، اسے بھی نقطۂ اختلاف بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے استدلال اور ان کی دعوت کی اصل خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ دنیا کے کان اب تک اس سے بالکل ناآشنا رہے ہیں اور آسمان کے نیچے بالکل پہلی مرتبہ انہوں نے اس کو آشکارا کیا ہے۔ ہمارے مناظرین جو اسلامی دعوت کے صحیح مزاج سے واقف نہیں ہیں، وہ بالعموم اسی طرح کے خبط میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلام کی کسی حقیقت کو جب بھی پیش کرتے ہیں اس کا اصل کمال اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ اس کو ایک نادر ترین حقیقت ثابت کر دکھائیں۔ یہ چیز قدرتی طور پر طبائع میں اُنس کے بجائے اس سے بیزاری پیدا کرتی ہے اور لوگ بجائے اس کے کہ اسے اپنی چیز سمجھ کر اس کا شوق کریں اسے اجنبی چیز سمجھ کر اُس سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔

الزامی طریقِ استدلال سے احتراز:

داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ الزامی طریقِ استدلال و جواب کبھی اختیار نہیں کرتے۔ الزامی طریقِ استدلال سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جس کو ہم اوپر استدلال بالتوازم کے عنوان سے ذکر کر چکے ہیں۔ بلکہ اس سے ہمارا اشارہ ہمارے مناظرین اور متکلمینِ حال کے اس غلط طریقہ کی طرف ہے جو عموماً وہ موجودہ معترضین اور نکتہ چینوں کے مقابل میں، اسلام کی حمایت کے لیے، اختیار کرتے رہے ہیں۔ ان کا معمولِ عام طریقہ یہ ہے کہ جہاں کسی مذہب والے نے اسلام کی کسی بات پر اعتراض کیا وہ جھٹ اسی قبیل کی مثالیں حریف کے مذہب کی تعلیمات کے اندر سے پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے اسلام کو اعتراض کی زد سے محفوظ کر لیا۔ حالانکہ یہ طریقۂ جواب اصولی طور پر غلط ہے۔ دوسرے کی کسی غلطی کی بنا پر ہماری کسی غلطی

کا حق ہونا تو الگ رہا ہمارے کسی حق کا حق ہونا بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ اس طریقِ استدلال کا فائدہ اگر کوئی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ معترض چُپ ہو جایا کرتا ہے اور اس سے ہمارے عزورِ نفس کو تسلی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے نہ تو مخالف کو اسلام کی حقانیت کا ثبوت ملتا، نہ خود اپنے آپ کو اس سے شرحِ صدر حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ الٹا اپنی ہی کمزوری کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے جو ہم خود اپنی زبان سے دوسروں کے لیے بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر امرِ حق اپنی دلیل خود اپنے اندر رکھتا ہے، اس کی دلیل دوسروں کے کسی باطل کے اندر نہیں ہوا کرتی۔ اس وجہ سے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کے دلائل خود اس کے اندر سے پیش کیے جائیں۔ اس معاملہ میں ہمارے متکلمین کی روش غلط ہونے کی دو جہیں دو ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مخالفین کے پراپیگنڈے سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات اسلام کے بعض نہایت سچے اصولوں کی سچائی خود ان کی اپنی نظروں میں مشتبہ ہو گئی اور انہیں ان کی حمایت کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نظر نہیں آیا کہ الزامی طریقِ جواب اختیار کر کے مخالف کو چپ کرائیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنی وکالت و حمایت کی ذمہ داری صرف اسلام ہی کی حد تک محدود نہیں رکھی، بلکہ قومی تعصب کی وجہ سے انہوں نے مسلمان قوم کی پوری تاریخ کی حمایت بھی اپنے سر لے لی، جس کی وجہ سے ان کا محاذِ جنگ بہت لمبا ہو گیا اور انہیں بہت سی ایسی چیزوں کا حق ہونا بھی ثابت کرنا پڑا جن کو حق ثابت کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں تھا جب تک وہ دوسروں کے بہت سے باطل کو بھی حق ثابت نہ کر دیں۔ ہمارے متکلمین کا وہ سارا لٹریچر، جو گزشتہ نصف صدی کے اندر تیار ہوا ہے اور جس میں جہاد، غلامی، تعددِ ازواج، طلاق اور مسلمان سلاطین کے کارناموں کے جواز وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، وہ تمام تر اسی صورتِ حال کی شہادت ہے۔ اس کو پڑھ کر کبھی تو ان حضرات کی مرعوبیت اور بے بسی پر افسوس ہوتا ہے اور کبھی ان کی غلط روی پر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ اگر وہ پراپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوتے اور

خواہ مخواہ کو پرائے جھگڑے اپنے سر نہ لیتے، بلکہ اپنی حمایت صرف اسلام ہی تک محدود رکھتے تو ان کی بہت سی بوالفضولیوں سے بالکل محفوظ رہ جاتے، جن میں ان کو چار و ناچار مبتلا ہونا پڑا اور جن کی وجہ سے وہ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اس کی دعوت کی راہ میں بہت سے کانٹے بو گئے، جو ایک ایک کر کے آج ان لوگوں کو چننے پڑیں گے جو اس راہ میں قدم رکھنا چاہیں گے۔

مخاطب کی نفسیات کا لحاظ

جس طرح ایک بیج کے نشوونما پانے کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی، بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح کلمۂ حق کی دعوت میں مجرّد حق کی فطری صلاحیتوں پر ہی اعتماد نہیں کر لینا چاہیے، بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ جن لوگوں کے سامنے وہ حق پیش کیا جا رہا ہے دعوت کے وقت نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان کی حالت کیا ہے۔ زمینوں کی طرح دلوں اور دلوں کے بھی موسم ہوتے ہیں اور ایک داعی کا فرض ہے کہ ان موسموں سے اسی طرح واقف ہو جس طرح ایک دہقان زمین کی فصلوں اور موسموں کو پہچانتا ہے اور اسی وقت کوئی بیج ڈالے جب موسم سازگار ہو۔ جو لوگ اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں، خواہ اپنی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ حق اپنی ذاتی کشش سے خود بخود دلوں میں جگہ پیدا کر لے گا، اس کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے، وہ اپنی اس غلطی کی سزا اپنی دعوت کی ناکامی کی شکل میں پاتے ہیں اور اُن کی نیک نیتی ان کی اس بے تدبیری اور غفلت کے نتائج سے اُن کو بچا نہیں سکتی جو مخاطب کی نفسیات کی رعایت کے باب میں اُن سے صادر ہوتی ہے۔

نفسیاتِ مخاطب کی رعایت کے دس اصول:

ایک داعی کو جن مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور اُن سے اُن کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر، جتنے مختلف نوعیت کے معاملے اس کو کرنے پڑتے ہیں، ان سب کی تفصیل نہ تو ممکن ہی ہے، اور نہ اس کے لیے یہاں گنجائش ہی ہے، لیکن حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے طرزِ عمل سے یا اُن ہدایات سے جو ان کو اس بارہ میں دی گئی ہیں، بعض اصولی باتیں مستنبط ہوتی ہیں جو بطور مثال ہم یہاں بیان کریں گے تاکہ ان کو پیش نظر رکھ کر لوگ از خود ان سے مزید اصول مستنبط کر لیں۔ اس چیز کا تعلق درحقیقت عام انسانی فہم سے ہے۔ ایک سلیم الطبع اور نیک نیت داعی، جو اپنے مقصد کو اچھی طرح پہچانتا ہے، اگر ان مثالوں کو پیش نظر رکھے گا تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنے طریقِ دعوت کو انبیاء کے طریقِ دعوت سے مشابہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ یہاں ہم جن اصولی باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں وہ دس ہیں۔

پہلا اصول :

ایک ہی چیز کے مختلف پہلو ہوا کرتے ہیں۔ بعض اعتبار سے وہ سہل و آسان ہوتی ہے، بعض اعتبار سے مشکل ہوتی ہے۔ کسی مبتدی کے سامنے اگر اس کو اس پہلو سے پیش کیجیے جو سہل ہے تو اس کو اس سے کچھ ایسی اجنبیت اور نفرت نہیں ہوگی، لیکن اگر پہلی ہی ملاقات میں اس کو دوسرے پہلو سے پیش کر دیجیے تو وہ فوراً اس سے وحشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوگا اور پھر شاید کبھی اس کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔ دینِ حق کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ بے گانہ سے بے گانہ آدمی کے لیے بھی وہ اپنے بعض پہلوؤں سے دل آویز اور دلکش ہے اور اگر اسی پہلو سے اس کو اس کے سامنے پیش کیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اس سے مانوس ہو کر اس کے نرم و سخت سب کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن مانوس سے مانوس آدمی بھی اس کے بعض پہلوؤں کو سخت اور گراں محسوس کرتا ہے اور اگر اس کے سامنے اسی

پہلو سے اس کو پیش کیا جائے تو مزید مانوس ہونا تو الگ رہا اندیشہ اس بات کا رہتا ہے کہ اس کا سابق اُنس بھی وحشت و اجنبیت سے بدل جائے۔ جو لوگ ایک شے کے مختلف پہلوؤں اور ان کے فرق کو نہیں جانتے یا اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ایک مبتدی کے سامنے ایک شے کا کون سا پہلو سب سے پہلے لانا چاہیے یا طبعاً ان کا مذاق ہی اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ سنگلاخ زمینوں ہی میں طبع آزمائی کرتے اور ہر بات میں تشدد ہی کو کمال دینداری خیال کرتے ہیں، وہ لوگ جب دعوتِ دین کا کام سنبھالتے ہیں تو ان کی دعوت کا نتیجہ بالعموم یہی ہوتا ہے کہ لوگ قریب آنے کے بجائے اور زیادہ دور ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ یہ لوگ دعوت کے لیے جو راہ اختیار کرتے ہیں وہ انسانی نفسیات کے لحاظ سے بالکل الٹی ہوتی ہے۔ اس سے بشارت کی جگہ نفرت اور اُنس کی جگہ بیزاری پھیلتی ہے۔ اسی چیز سے روکنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: یَسِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا[1] (خوشخبری دو، لوگوں میں نفرت نہ پھیلاؤ) اور داعیانِ حق کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ بتایا ہے کہ فَاِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُیَسِّرِیْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِیْنَ[2] (تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو)۔

دوسرا اصول:

نفسیاتی نقطۂ نظر سے دوسری اہم چیز، ایک داعی کے لیے قابلِ لحاظ، یہ ہے کہ اسے کسی حال میں بھی اپنے مخاطب کے اندر حمیتِ جاہلیت کے بھڑکنے کا موقع نہیں پیدا

---

[1] صحیح البخاری: کتاب العلم، باب ۱۱

[2] صحیح البخاری: کتاب الوضوء، باب ۵۸

ہونے دینا چاہیے۔ ہر داعیِ حق کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قوم اپنے معتقدات و روایات کے ساتھ کم و بیش اس طرح کی وابستگی رکھتی ہے جس طرح کی وابستگی ایک داعیِ حق اپنے معتقدات کے ساتھ رکھتا ہے۔ یہ وابستگی اگر باطل ہے تو اس کی اصلاح کا راستہ یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے جن کی وجہ سے یہ غلط وابستگی قائم ہے اور ان کی اصلاح کو اس وابستگی کے توڑنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ حق پرستی کے جوش یا باطل کی مخالفت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر یہ ہرگز نہ کیا جائے کہ اس غلط وابستگی کے فکری اسباب کی اصلاح کے بجائے خود اسی پر براہِ راست حملہ کر دیا جائے۔ اس طرح کے براہِ راست حملہ کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے ——— اور یہی ہو سکتا ہے ——— کہ مخاطب حمیتِ جاہلیت کے جوش سے بے خود ہو کر دعوت کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس جوش میں وہ ایسا اندھا بہرا ہو جاتا ہے کہ جس اینٹ پتھر پر اس کا ہاتھ پڑ جاتا ہے، وہی اٹھا کر، وہ داعی پر پھینک مارتا ہے۔ سورۂ انعام میں داعیانِ حق کو اسی چیز سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ (الانعام - ٦ : ١٠٨)	اور اللہ کے سوا یہ جن کو پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دیجیو کہ وہ تجاوز کر کے بے خبرانہ اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔ اسی طرح ہم نے ہر گروہ کی نگاہوں میں اس کا عمل کھبا رکھا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک ہدایت قرآن مجید نے یہ بھی دی ہے کہ دعوتِ حق کے کام کے سلسلہ میں ساری گفتگو اصل مقصد تک محدود رہنی چاہیے۔ اگر مخاطب کی طرف سے کوئی ایسا پہلو چھیڑ دیا جائے جس سے دونوں فریق کے مقتداؤں اور لیڈروں میں ترجیح و تفضیل کا معرکہ کارزار گرم ہو جانے کا اندیشہ ہو تو داعیانِ حق کو چاہیے کہ بحث کی غلط رَو میں بہہ جانے کے بجائے اس کو صحیح رخ پر لانے کی کوشش کریں اور مخاطب کے لیڈروں اور مقتداؤں

کی تحقیر کے بجائے، ان کے لیے اُس عزت و احترام کا اعتراف کریں جس کے وہ واقعی طور پر مستحق ہیں:

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۚ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ۚ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ۚ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ۝ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝	اور میرے بندوں سے کہہ دو کہ وہی بات کہیں جو بہتر ہے۔ بے شک شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے، شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن تو ہے ہی تمہارا رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے گا تم پر رحم فرمائے گا یا اگر چاہے گا تم کو عذاب دے گا اور ہم نے تم کو ان پر مسئول بنا کر مامور نہیں کیا ہے، اور تمہارا رب ہی خوب جانتا ہے ان کو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت بخشی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی۔

(بنی اسرآئیل - ۱۷: ۵۳-۵۵)

اس ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے کہ داعیٔ حق کو ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو عصبیت جاہلیت کو بھڑکانے والی اور مخاطب کو عناد و اختلاف کی راہ پر ڈال دینے والی ہوں۔

تیسرا اصول:

جو لوگ عزت و پیشوائی کے مقام پر سرفراز رہتے چلے آنے کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے اپنے لیے خطاب و کلام میں تعظیم و تکریم کے خوگر ہو چکے ہوں اور اندیشہ

ہو کہ اس کی خلاف ورزی سے ان کے پندارِ نفس کا شیطان جاگ اٹھے گا اور ان کو حق بات سننے سے روک دے گا، داعیٔ حق کو چاہیے کہ ایک خاص حد تک اُن کی اِس بیماری کا لحاظ رکھے تاکہ قبولِ حق میں ان کے اپنے نفس کی مزاحمتوں کے سوا داعی کی طرف سے کوئی جدید مانع نہ پیدا ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی پہلو سے ہدایت کی گئی کہ:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ	تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ، بے شک
طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا	وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔ پس اس
لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ	کو نرمی کے ساتھ دعوت دو، شاید وہ
اَوْ يَخْشٰى ۝	یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

(طٰہٰ - ۲۰ : ۴۳ - ۴۴)

لیکن یہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جہاں تک اس حق کے احترام و وقار کے خلاف نہ ہو، جس کو داعی پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ لحاظ کسی پہلو سے حق کے وقار کو صدمہ پہنچائے تو پھر یہ چیز جائز نہیں ہے۔ قرآن میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

چوتھا اصول:

جس طرح ایک ماہر طبیب مریض کی عمر، اس کے مزاج اور اس کے مرض کی شدت و خفت کے لحاظ سے اس کے لیے دوا کی خوراک تجویز کرتا ہے، اسی طرح ایک داعیٔ حق کا بھی فرض ہے کہ وہ مخاطب کی استعداد، اس کی طلب اور اس کے ظرف کے لحاظ سے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ اس چیز کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے کے لیے صرف مخاطب کی نوعی استعداد اور نوعی قابلیتوں ہی کو سامنے نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ اس کی قومی خصوصیات اور اس کے انفرادی حالات کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں کا لحاظ کیے بغیر کسی دعوت کی کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہی چیز ہے جس کی وجہ سے

قرآن مجید مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا:

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ	اور قرآن کو تو ہم نے تھوڑا تھوڑا کرکے
عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ	اس لیے اتارا کہ تم اس کو لوگوں کو
وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝	ٹھہر ٹھہر کر سناؤ اور ہم نے اس کو نہایت
(بنی اسرآءیل - ۱۷: ۱۰۶)	اہتمام سے اتارا ہے۔

اسی طرح قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی دعوت میں بہت سی باتیں مخاطبوں کے اُفتادِ مزاج کے لحاظ سے اختیار کی گئیں۔ مثلاً چونکہ وہ ضدی اور جھگڑالو (قَوْمًا لُّدًّا) تھے اس وجہ سے ان سے بحث و مناظرہ کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا جو ایک جھگڑالو اور ضدی قوم کے لیے موزوں تھا۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیہات سے آنے والے لوگوں کے سامنے دینِ حق کو جس انداز سے پیش کرتے تھے وہ اس سے بالکل مختلف ہوا کرتا تھا جس انداز سے آپ مکہ اور مدینہ کے شہریوں کو دعوت دیتے تھے۔ وفدِ عبدالقیس نے آپ سے شکایت کی کہ ہمارے اور آپ کے درمیان قریش کا قبیلہ حائل ہے اور اُن کی دشمنی کی وجہ سے اشہرِ حُرُم کے سوا اکثر مہینوں میں ہم آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتے۔ اِس وجہ سے آپ ہمیں کچھ ایسی اصولی باتیں بتا دیجیے جنہیں ہم خود بھی اختیار کر سکیں اور ان کی دعوت دوسروں کو بھی دے سکیں۔ آپ نے ان کی ضرورت اور حالت کو سامنے رکھ کر صرف چار چیزوں کا حکم دیا اور چار چیزوں کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اپنی قوم کے لوگوں کو ان چار چیزوں کا حکم دو اور ان چار چیزوں سے روکو۔ اس سے زیادہ تفصیل آپ نے ان کے سامنے نہیں رکھی۔

ظاہر ہے کہ طریقِ دعوت کا یہ فرق محض ان جماعتوں کی نفسیات کے اختلاف کی بنا پر تھا۔ جن کا اختلاف معمولی اور جن کی الجھنیں سادہ تھیں، اُن کے سامنے دین کی سیدھی سادی تعلیمات پیش کر دی جاتی تھیں تاکہ وہ ان پر عمل کریں۔ اس کے برعکس

جو لوگ گہری الجھنیں رکھتے تھے ان کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ لگاتار دعوت دی جاتی تھی۔

پانچواں اصول :

جس طرح ایک دہقان کے لیے زمین کی تیاری اور موسم کی سازگاری کے بغیر بیج ڈال دینا جائز نہیں ہے اور جس طرح ایک طبیب کو مرض کے بحران کی حالت میں مریض کو دوا دینے سے احتراز کرنا چاہیے، اسی طرح ایک داعی حق کو ان تمام اوقات میں دعوت سے احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اعتراض اور نکتہ چینی کی طرف مائل ہو۔ نہ صرف اس حالت میں دعوت پیش کرنے سے احتراز ضروری ہے، بلکہ اگر دعوت کو پیش کرنے کے بعد بھی مخاطب پر اعتراض و نکتہ چینی کا دورہ پڑ جائے تو داعی کو چاہیے کہ بحث کو بڑھانے کی بجائے اس کو وہیں ختم کر کے وہاں سے ہٹ جائے اور کسی اور مناسب موقعہ کا انتظار کرے، جب مخاطب خالی الذہن یا کم از کم اعتراض و نکتہ چینی کے رجحان سے خالی ہو:

إِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ	اور جب تم ان لوگوں کو دیکھو جو ہماری
فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ	آیتوں میں مین میکھ نکالتے ہیں تو ان
حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ	سے کنارہ کش ہو جاؤ یہاں تک کہ
غَيْرِهِ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ	وہ کسی اور بات میں مصروف ہو جائیں۔
فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ	اور اگر شیطان تمہیں بھلاوے تو یاد
مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝	آنے کے بعد ان ظالم لوگوں کے ساتھ
(الانعام - ٦ : ٦٨)	نہ بیٹھو۔

اس صریح ممانعت کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء نے تبلیغ دین کے لیے مناظرہ کے طریقے کو کیسے جائز سمجھا، جس میں دونوں فریق اکٹھے ہی اس

مقصد سے ہوتے ہیں کہ اپنے حریف کی بات کی تردید و تکذیب کریں گے اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں کو مناظرہ کی مجالس کا کچھ تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان مجالس سے صرف اس خوش (مونگانی) کے شوق کو شہ ملتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اس کی بُو محسوس کرتے ہی داعیٔ حق کو دامن جھاڑ کے اٹھ جانا چاہیے۔ لیکن ہمارے مناظرین کو یہ بُو اس قدر مرغوب رہی ہے کہ جس قدر یہ بڑھی اسی قدر اُن کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا۔

چھٹا اصول :

اسی طرح اُن مواقع سے بھی داعی کو احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اپنی کسی ایسی دلچسپی میں منہمک ہو جس کو چھوڑ کر دعوتِ حق کی طرف متوجہ ہونا اس کی طبیعت پر گراں گذرے۔ اگرچہ یہ حالت پہلی حالت سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں عناد و اختلاف کا جذبہ شامل نہیں ہے، لیکن مخاطب کی طبیعت کی عدم مستعدی کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے :

عن عکرمۃ، عن ابن عباسؓ	عکرمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن
قال: حدث الناس	عباسؓ نے کہا کہ لوگوں کو جمعہ جمعہ وعظ
کل جمعۃ مرۃ۔ فان ابیت	کیا کرو۔ اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں
فمرتین۔ فان اکثرت	دوبار۔ اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو
فثلاث۔ ولا تمل الناس	تو تین بار۔ اور لوگوں کو اس قرآن سے
ھذا القرآن۔ ولا الفینک	بیزار نہ کردو اور میں تمہیں اس حال میں نہ
تاتی القوم وھم فی	دیکھوں کہ تم کسی جماعت کے پاس جاؤ
حدیث من حدیثھم فتقص علیھم	اور وہ اپنے کسی اور کام میں مشغول ہوں

فتملهم. ولكن انصت فاذا امروك فحدثهم وهم يشتهونه[1]

اور اس حال میں تم ان کو اپنا وعظ سنانا شروع کر دو اور اس کا نتیجہ بیزاری ہو بلکہ تمہیں چاہیے کہ تم خاموش رہو اور جب لوگ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں۔

ساتواں اصول :

داعی کے لیے اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی خشکی و یک رنگی، اس کی بے ضرورت تکرار، اور اس کے بے فائدہ طول بیان سے سننے والے بدمزہ اور بیزار نہ ہونے پائیں :

عن ابی وائل، قال: كان عبد الله يذكر الناس في كل خميس. فقال له رجل: يا ابا عبد الرحمٰن! لوددت انك ذكرتنا كل يوم. قال: اما انه يمنعني من ذلك اني اكره ان امُلكم واني اتخولكم بالموعظة كما كان رسول الله صلى الله عليه وسلم

ابو وائل سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہر جمعرات کو وعظ کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا: اے ابوعبدالرحمٰنؓ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی کنیت ہے) میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ فرمایا کریں۔ انھوں نے جواب دیا: میں ایسا صرف اس خیال سے نہیں کرتا کہ کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمہیں نصیحت کرتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب ما یکرہ من السجع فی الدعاء

يتخولنا بها مخافة السآمة علينا[1] — نافذ کرکے نصیحت کیا کرتے تھے تاکہ ہم بیزار نہ ہونے پائیں۔

یہ سطریں لکھتے وقت ہمارے سامنے اُن واعظین اور اُن کے بدقسمت اور مظلوم سامعین کی ایک تصویر آگئی ہے جن کی وعظ گوئی کا سب سے بڑا ہنر ان کا لایعنی طولِ کلام ہوتا ہے جو اتنی موٹی سی بات سے بھی واقف نہیں ہیں کہ بہتر سے بہتر بات بھی بے ضرورت بار بار دہرانے سے ناگوار بن جایا کرتی ہے اور وعظ سنانے کے لیے لوگوں کے پیچھے پڑجانے سے نہ صرف یہ کہ دعوتِ دین کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ الٹا اس سے شدید نقصان پہنچتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ لوگوں کو وقفہ وقفہ کے ساتھ نصیحت فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ اکتانے نہ پائیں۔ آپ کے خطبے نہایت مختصر ہوا کرتے تھے۔ نیز روایات میں آتا ہے کہ آپ کی ہدایت تھی کہ "جب نصیحت کرو تو مختصر نصیحت کرو"۔ اور بعض روایات میں خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانش مندی کی علامت قرار دیتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "بعض خطبے جادو ہوتے ہیں" یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خطبے مختصر اور جامع و بلیغ ہونے چاہئیں کہ جادو کی طرح دلوں پر اثر کریں، نہ کہ سننے والے کی طبیعت کو کند کردیں کہ اس میں کسی بات کو سننے اور اس کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہ جائے۔

آٹھواں اصول:

ایک داعیٔ حق کو اپنے گرد وپیش کا پوری ہوشیاری و مستعدی کے ساتھ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کی تخم ریزی کے لیے کب کوئی موزوں موقع ہاتھ آتا ہے۔ جونہی وہ

---

[1] صحیح البخاری: کتاب العلم، باب من جعل لاهل العلم ایاما معلومة

محسوس کرے کہ اس کے مقصد کے لیے کوئی موقع پیدا ہوگیا ہے، بغیر کسی توقف کے اُسے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے اُسوہ میں ملتی ہے:

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ	اور اس کے ساتھ دو اور جوان بھی جیل خانہ
قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ	میں داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے کہا
اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ	کہ میں اپنے آپ کو خواب میں دیکھتا ہوں
اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ	کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے
رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ	کہا کہ میں اپنے کو دیکھتا ہوں کہ میں اپنے
مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا	سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے
نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝	چڑیاں کھا رہی ہیں۔ آپ ہمیں اس کی
قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ	تعبیر بتایئے۔ ہم آپ کو خوب کاروں میں
اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ	سے سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا: جو کھانا تمہیں
اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا	ملتا ہے وہ آئے گا نہیں کہ میں اس کے
عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ	آنے سے پہلے پہلے تمہیں اس کی تعبیر بتا
مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	دوں گا۔ یہ اس علم میں سے ہے جو میرے
وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ	رب نے مجھے سکھایا ہے۔ میں نے ان
كٰفِرُوْنَ ۝ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ	لوگوں کے مذہب کو چھوڑا ہے جو اللہ پر
اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ	ایمان نہیں رکھتے اور آخرت سے بھی
وَيَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَآ اَنْ	لوگ منکر ہیں۔ اور میں نے اپنے بزرگوں
نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ ذٰلِكَ	ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے مذہب
مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى	کی پیروی کی۔ ہمیں حق نہیں کہ ہم کسی چیز

النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ
ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ
اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝
مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ
اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰهُ
بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۭ اِنِ الْحُكْمُ
اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ
اِيَّاهُ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝
يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ
اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ
خَمْرًا ۭ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ
فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ
قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ
تَسْتَفْتِيٰنِ ۝

(یوسف - ۱۲: ۳۶ - ۴۱)

کو اللہ کا شریک ٹھہراتے۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے۔ اے میرے جیل کے دونوں ساتھیو! کیا الگ الگ بہت سے رب بہتر ہیں یا اکیلا اللہ ہی سب پر حاوی و غالب؟ تم اس کے سوا نہیں پوجتے مگر چند ناموں کو جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ اختیار و اقتدار صرف اللہ ہی کا ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو۔ یہی دین قیم ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اے میرے زنداں کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے آقا کو شراب پلانے کی خدمت انجام دے گا۔ رہا دوسرا تو اس کو سولی دی جائے گی، پھر پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ اس امر کا فیصلہ ہوا جس کے بارے میں تم پوچھ رہے تھے۔

اس پر ایک نظر ڈال کر واقعہ کی پوری تصویر چشم تصور کے سامنے لائیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو آدمی جیل میں داخل ہوتے ہیں۔ دونوں خواب دیکھتے ہیں۔ انہیں خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ قید خانہ کے آدمیوں میں ہر اعتبار

سے حضرت یوسف علیہ السلام ہی ایسے آدمی ان کو نظر آتے ہیں جن کی طرف اس غرض کے لیے وہ رجوع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حسنِ عقیدت و احترام کے جذبہ کے ساتھ، اپنے خواب وہ ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس موقعہ پر یہ نہیں کرتے کہ انہیں خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دیں یا ان کے جذبۂ عقیدت سے فائدہ اٹھا کر ان پر اپنی شخصیت و بزرگی کا رعب جمانے کی کوشش کریں اور اس سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہیں، بلکہ وہ اُن کے اس التفات کو غنیمت سمجھ کر وہ دعوت ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو ان کے دل سے لگی ہوئی ہے: ؎

امیر جمع ہیں احباب درد دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اور پیش کرنے کا انداز ایسا اختیار فرماتے ہیں کہ گویا سلسلۂ سخن میں بات میں بات پیدا ہو گئی ہے، نہ کہ قصد کر کے ایک بات کے کہنے کے لیے موقع پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے ایک اہم حقیقت تو یہ سامنے آئی کہ جس طرح ایک کسان تخم ریزی کے لیے، گھات لگائے بارش کا انتظار کرتا ہے، اسی طرح ایک داعیٔ حق کو بھی اپنے گرد و پیش پر نظر رکھنی چاہیے کہ کب کسی کے دل کے اندر اس کے لیے وہ التفات پیدا ہوتا ہے جو اس کی دعوت کی تخم ریزی کے لیے فصل و موسم کا کام دے سکتا ہے۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے کوئی اس طرح کا موقع میسّر آجائے تو نہ تو اس کو ضائع کرنا جائز ہے اور نہ اس اعلیٰ مقصد کے سوا کسی اور غرض کے لیے اس کو استعمال کرنا جائز ہے۔ اس طرح کے مواقع جب خود غرض لوگوں کو ملتے ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان کو دعوتِ حق کے لیے استعمال کریں، اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو اپنے ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنائیں۔ اس زمانہ میں عام طور پر ہمارے علماء و مشائخ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ وہ جب اپنی طرف کسی دل کو ملتفت پاتے ہیں تو اس کو دیکھ کر خوش تو

بہت ہوتے ہیں، لیکن ان کی خوشی اس طرح کی نہیں ہوتی جس طرح کی خوشی حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھیوں کے التفات سے ہوئی تھی۔ بلکہ یہ خوشی اس مکڑی کی خوشی کی طرح ہوتی ہے جو اپنے اردگرد جالا تن کر مکھیوں کے انتظار میں بیٹھتی ہے اور جب کسی مکھی کو پاس آتے دیکھتی ہے تو جوشِ نشاط سے ناچنے لگتی ہے کہ ایک فریب شکار ہاتھ آیا۔

نواں اصول :

ہر داعیٔ حق کے لیے بحث و استدلال میں مخاطب کے درجہ اور حیثیت کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ مثلاً اہلِ علم سے جو خطاب ہوگا وہ جس انداز اور لب و لہجہ میں ہوگا وہ اُس انداز اور لب و لہجہ سے بالکل مختلف ہوگا جو عوام کے لیے اختیار کیا جائے گا۔ ایک داعیٔ حق کے لیے محض اس بنا پر کہ پوری سچائی صرف اسی کے ساتھ ہے، یہ بات جائز نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ دوسری جماعتوں کو جن کے پاس پوری سچائی نہیں ہے، ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دے۔ بلکہ اس کو چاہیے کہ ان کو ٹھیک ٹھیک تول کر ان کے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے ان کی جگہوں پر رکھے اور ہر ایک کی حیثیت کا لحاظ کر کے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ مثلاً اہلِ کتاب کے سامنے دعوت پیش کرنے کے متعلق قرآن مجید نے یہ ہدایت فرمائی ہے :

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ	اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر اس
اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا	طریقہ پر جو بہتر ہے بجز ان کے جو ان
الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَ	میں سے ظالم ہیں اور کہو کہ ہم ایمان
قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ	لائے اس چیز پر جو ہم پر نازل ہوئی اور
اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا	اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اتاری گئی

وَاِلٰـهُـكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (العنکبوت - ۲۹ : ۴۶)

اور ہمارا اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کی فرماں برداری کرنے والے ہیں۔

یہاں جس احسن طریقے سے اہلِ کتاب سے مباحثہ کرنے کی اجازت دی ہے اس کی صورت بھی بیان کر دی ہے کہ وہ جن پہلوؤں سے تمہارے ہم رتبہ ہیں یا جو امور ان کے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں، ان کا اقرار کرو تاکہ ان کے اور تمہارے درمیان نفرت کے بجائے موانست اور دوری کے بجائے قرب پیدا ہو اور اس کے بعد ان سے مطالبہ کرو کہ ان مسلمات سے جو باتیں لازم آتی ہیں ان میں بھی وہ تمہارے ساتھ متفق ہو جائیں۔ اس طریقِ دعوت کا نفسیاتی اثر مخاطب پر یہ ہوگا کہ وہ یہ دیکھ کر کہ داعی نہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہے اور نہ اپنی دعوت کو کسی نئے انکشاف کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، بلکہ اس دعوت میں جتنا حصہ مخاطب کا ہے اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر رہا ہے۔ وہ اس پر غور کرنے کی طرف مائل ہوگا اور اگر وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم نہ ہوگا تو اس کو قبول بھی کرے گا۔ اور اگر ایسا نہ کیا جائے، بلکہ اہلِ علم اور اہلِ کتاب کو بھی اسی طرح خطاب کیا جائے جس طرح اُمّیوں کو خطاب کیا جا سکتا ہے تو قدرتی طور پر ان لوگوں کا پندار مجروح ہوگا جو اُمّی ہی کی طرح علم اور کتاب کے مدعی ہیں اور یہ چیز قبولِ دعوت کی راہ میں شدید مزاحمت پیدا کرے گی۔

دسواں اصول :

داعیِ حق اگر مخاطب کے اندر عناد اور ہٹ دھرمی کی بُو محسوس کرے تو اپنی طرف سے ہرگز اس بات کا موقع نہ دے کہ اس کا یہ مرض مزید ابھرے، بلکہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر وہ داعی کی کسی دلیل پر ایسا معارضہ کر بیٹھے

جو بالکل کھلی ہوئی دھاندلی ہو، جب بھی اس دلیل کے پیچھے پڑنے اور اس پر رد و کد کے بجائے اس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے سامنے امرِ حق کسی ایسے پہلو سے پیش کیا جائے جس پر اس کو اپنی ہٹ دھرمی کے اظہار کا موقع نہ ملے۔ بلکہ اگر اس میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو تو اس کو قبول کرے اور اگر معاندہی ہو تو کم از کم ہکا بکا ہو کے رہ جائے، اس کو بحث و جدال کی راہ نہ ملے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ قرآن مجید میں مذکور ہے، جو اس کی بہترین مثال ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ	کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے، تو وہ کافر یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

(البقرۃ - ۲ : ۲۵۸)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلیل پیش کی تھی وہ معترض کے معارضہ سے ذرا بھی مجروح نہیں ہوئی تھی۔ وہ چاہتے تو اس پر بہت کچھ فرما سکتے تھے، لیکن مخاطب کی نفسیات کا اندازہ کر لینے کے بعد اگر وہ اس پر مزید اصرار فرماتے تو یہ چیز اس طریقے

کے بالکل خلاف ہوتی جس کی تلقین قرآن نے فرمائی ہے کہ :

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ	اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت
بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ	اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو
الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ	اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث
هِیَ اَحْسَنُ ط	کرو جو پسندیدہ ہے۔

(النحل - ١٦ : ١٢٥)

انبیائے کرام کا طریقِ تربیت

کوئی دعوتِ حق دنیا میں مُثمر اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ ایک تدریجی اور مستقل پروگرام تربیت کا نہ ہو۔ اس چیز کے لیے یوں تو ہر دعوت و تحریک کی فطرت تقاضا کرتی ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک دعوتِ حق کا تو یہ ایسا لازمی جزو ہے کہ اس کے بغیر اس کا کوئی تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ، جیسا کہ پچھلے ابواب سے معلوم ہو چکا ہے، زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ کو متاثر نہیں کرتی، بلکہ اس کے تمام ظاہر و باطن کو ایک نیا جلوہ دیتی ہے، اور صرف کسی جزوی تبدیلی ہی کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھتی، بلکہ ہماری ساری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک بالکل نیا سانچہ اور نئی سکیم پیش کرتی ہے۔ اس وجہ سے یہ اس کے عین مزاج ہی کا تقاضا ہے کہ جس تدریج و ترتیب کے ساتھ خود آگے بڑھتی ہے اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے بالکل متوازی ایک تربیت کا پروگرام بھی ہوتا ہے جو اہمیت میں کسی طرح بھی اصل دعوت سے کم نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تربیت کی اہمیت اصل دعوت سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہو۔ کیونکہ یہ تربیت ہی ہے جس کی وجہ سے کوئی دعوت دلوں میں جڑ پکڑتی ہے، پھر نشوونما پاتی ہے، پھر برگ و بار لاتی ہے، یہاں تک

کر ایک دن اپنے فوائد و برکات سے معاشرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔

ایک داعیٔ حق کے کام کی صحیح مثال ایک دہقان کے کام سے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح اس کا مقصد صرف اتنی سی بات سے حاصل نہیں ہو سکتا کہ کچھ بیج کسی زمین میں ڈال کر فارغ ہو بیٹھے اسی طرح ایک داعیٔ حق کا کام بھی صرف اتنے سے انجام نہیں پا سکتا کہ وہ لوگوں کو کچھ وعظ سنا کر سو رہے۔ بلکہ اس کے مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر اپنی پھیلائی ہوئی دعوت کے ساتھ وہی لگاؤ ہو جو ایک فرض شناس کسان کو اپنے بوئے ہوئے بیج کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس طرح کسان نگرانی کرتا ہے کہ بیج زمین میں جڑ پکڑے، اس کو صحیح وقت پر پانی ملے، موسم کی ناسازگاریوں سے محفوظ رہے، صحیح طور پر نشوونما پائے، بے گانہ سبزے اس کی ترقی میں مزاحم نہ ہوں، فضا کے پرندوں اور زمین کے چرندوں کی تاخت سے وہ سلامت رہے؛ اور جب ایک مدت تک اس دُھن میں اپنے دن کے اطمینان اور رات کے سکون کو وہ درہم برہم رکھتا ہے، لگاتار محنت اور مسلسل نگہداشت کرتا ہے، تب جا کر کہیں اپنی محنت کا پھل پاتا ہے۔ اسی طرح ایک داعیٔ حق کو بھی اسی صورت میں اپنی دعوت کو پھولتے پھلتے دیکھنا نصیب ہوتا ہے جب وہ دعوت کے ساتھ ساتھ تربیت کی جانکاہیوں کے ایک طویل سلسلہ کو جھیلنے کی قابلیت اور ہمت رکھتا ہو۔ ورنہ جس طرح ایک غافل کسان کے بوئے ہوئے بیج زمین اور موسم کی بے مہریوں اور چرند و پرند کی ترکتازیوں کی نذر ہو جاتے ہیں، اسی طرح ایک داعی کی دعوت بھی صدا بصحرا ہو کے رہ جاتی ہے۔

جماعتی تربیت کے پانچ اصول:

انبیاء علیہم السلام کے طریقِ دعوت و تربیت پر غور کرنے سے جماعتی تربیت کے لیے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے بعض اہم چیزوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں

پہلا اصول :

جماعتی تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ داعی کو تعلیم و دعوت کے کام میں جلد بازی سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس کو یہ برابر دیکھتے رہنا چاہیے کہ تعلیم کی جو خوراک اس نے دی ہے وہ اچھی طرح ہضم ہو کر لوگوں کے فکر و عمل کا جزو بن گئی ہے یا نہیں۔ اس کا پورا پورا اندازہ کیے بغیر اگر مزید غذا دے دی گئی تو اس کا نتیجہ صرف فسادِ معدہ اور سوءِ ہضم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ جن لوگوں نے داعیانِ حق کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ ہر داعیٔ حق سے معاملۂ دعوت میں جلد بازی کے لیے دو طرفہ مطالبہ ہوتا ہے۔ جو لوگ دعوت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں وہ حق کی لذت سے ابھی نئے نئے آشنا ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نئی نئی آشنائی ان میں حق کا ایسا شوق پیدا کر دیتی ہے کہ تدریج و ترتیب کا پروگرام ان پر بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ حق کی حرص میں اس طرح مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنی بھوک اور قوتِ ہضم کا صحیح اندازہ کر پاتے، نہ جماعت کے دوسرے کمزوروں کی کمزوری کا لحاظ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھی اپنی اصلی حیثیت سے زیادہ توتے ہیں اور اپنے کمزور ساتھیوں کو بھی ان کی استعداد سے زیادہ قیاس کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ان کی طرف سے برابر "هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" کا مطالبہ رہتا ہے۔ ان کے ماسوا دوسرے لوگ جو ابھی دعوت کے مخالف ہوتے ہیں وہ دعوت کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہ اگر اس کے پیش کردہ پروگرام میں حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں پاتے تو یہی مطالبہ شروع کر دیتے ہیں کہ اپنا پورا پروگرام پیش کرو۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز ان کے مطالبہ کے جواب میں فوراً نہ پیش کی گئی تو وہ لوگوں پر یہ ظاہر کر سکیں گے کہ یہ محض ایک بے مقصد اور مجہول دعوت ہے: اس کے آگے نہ کوئی متعین منزلِ مقصود ہے نہ اس منزل تک پہنچنے

کا کوئی واضح اور ٹھوس پروگرام ہے اور اگر کوئی چیز پیش کی گئی تو اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈ کر دوسروں کو دکھا سکیں گے اور اگر کوئی رخنہ تلاش کے باوجود بھی نہ مل سکا تو اس کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

علاوہ ازیں ایک سچے داعیِ حق کے اندر تبلیغِ حق کی ایک پُرزور خواہش خود ہی دبی ہوئی ہوتی ہے جو اتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت اگر اس کی نگرانی نہ کرے تو صبر و انتظار اور تدریج و ترتیب کے سارے حدود و قیود وہ توڑ ڈالے۔ اس خواہش کو یہ دو طرفہ مطالبہ جب مشتعل کر دیتا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی میانہ روی کی اس روش سے ہٹ جاتا ہے جو اس کے مقصد کی کامیابی اور جماعت کی صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے۔ ہر چند حق کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے آدمی میں مریدوں کی سی بھوک ہو جو اسے مضطرب بھی رکھے، بے صبر بھی بنا دے اور جلد بازی پر بھی مجبور کرے، لیکن جماعت کی تربیت کا مطالبہ حق کی قدر شناسی اور محبت کے مطالبے سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا اس وجہ سے ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح صحیح توازن قائم رکھے۔ اگر پہلی چیز کا تقاضا اس کو جلد بازی کے لیے بے چین کرے تو چاہیے کہ دوسری چیز کا مطالبہ اس کو انتظار پر مجبور کرے۔ اگر اعلانِ حق کا شوق اور حمایتِ حق کا جذبہ اس کو اکسائے کہ نہ وہ اہلِ شوق کے شوق کو تشنہ چھوڑے نہ معاندین پر اتمامِ حجت میں کوئی کسر باقی رہنے دے تو چاہیے کہ تربیت کے اہتمام کے لیے وہ اس امر پر بھی نظر رکھے کہ کہیں شراب قدح خوار کے ظرف سے زیادہ نہ ہو جائے۔

جب کبھی ایسا ہوا کہ پہلا جذبہ اس قدر غالب آگیا ہے کہ دوسرے پہلو کی پوری رعایت نہیں ہو سکی ہے تو جماعتی تربیت میں ایسا نقص رہ گیا ہے کہ بعد میں اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی رخنے سے شیطان نے جماعت کے اندر گھس کر انڈے بچے دے دیے ہیں اور پھر اس کے پھیلائے ہوئے فتنوں کی لپیٹ میں پوری جماعت آگئی۔ اس کی

سب سے زیادہ عبرت انگیز مثال ہم کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکل کر سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو احکام شریعت سے آگاہ کرنے کے لیے طور پر بلایا اور اس غرض کے لیے ایک خاص دن معین فرما دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس معین دن سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ان کے اندر اللہ کے احکام معلوم کرنے اور اس کی رضا طلبی کا جو جوش و جذبہ تھا اولاً تو وہ خود ہی اتنا قوی تھا کہ باریابی کا اشارہ پانے کے بعد وقت اور تاریخ کی پابندیاں اس پر شاق تھیں۔ ثانیاً قوم کی طرف سے ہر قدم پر جو مطالبے پر مطالبے ہو رہے تھے اس سے بھی اس جذبہ کو تحریک ہوئی ہوگی۔ اگرچہ یہ جذبہ نہایت اعلیٰ اور محمود جذبہ تھا اور طور پر معین وقت سے پہلے پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اللہ کے احکام معلوم کرنے کے لیے نہایت بے چین اور مضطرب دل رکھتے ہیں، لیکن اس معاملہ کا ایک دوسرا قابل اعتراض پہلو بھی تھا، جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر نہیں گئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فوراً بلانے کی بجائے ان کے لیے جو ایک خاص وقت مقرر کیا تو اس سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ یہ وقفہ وہ قوم کی تربیت میں صرف کریں اور جن اصولی باتوں کی قوم کو تعلیم دی جا چکی ہے اس کو اچھی طرح ان کے اندر پختہ کریں تاکہ آزمائشوں اور فتنوں میں پڑنے کے بعد بھی وہ ایمان و اسلام کو سلامت رکھ سکے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے مزید احکام معلوم کرنے کا شوق ان پر اس قدر غالب آگیا کہ تربیت کی اہمیت کا احساس اس کے مقابل میں دب گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے دشمنوں نے ان کی اس غیر حاضری اور قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور قوم کے ایک بڑے حصے کو گو سالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اور اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت پسندی پر ڈالی جو ہر چند تعلیم و دعوت ہی کی راہ میں تھی، لیکن بہرحال تربیت کی ذمہ داریوں سے غافل کرنے والی ثابت ہوئی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس عجلت اور اس کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝	اور اے موسیٰ! یہ تم کو، اپنی قوم کو چھوڑ کر
قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى	جلدی آنے پر کس نے ابھارا؟ اس نے کہا:
اَثَرِىْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ	وہ لوگ بھی میرے پیچھے ہی ہیں، اور میں
لِتَرْضٰى ۝ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا	اے میرے رب! تیری خوشنودی کے لیے
قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ	جلدی چلا آیا ہوں۔ فرمایا تو ہم نے تمہاری قوم
وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ۝	کو تمہارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور
(طٰہٰ - ۲۰: ۸۳-۸۵)	سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایک داعی کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت کرے تاکہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکر و عمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی ان پر اس کی گرفت قائم رہ سکے۔ جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور اس چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لیے جو صبر و انتظار مطلوب ہے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا، اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کیے بغیر مارچ کرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا، دوسری طرف اس کے مفتوحہ علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی۔

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی اس سبق آموز مثال کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجلت پر گرفت فرمائی ہے جو آپ کے اندر احکام الٰہی معلوم کرنے کے لیے تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے فطری شوقِ علم اور قوم کی جلد بازی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وحیٔ الٰہی جلد جلد نازل ہو تاکہ آپ اپنے

شوقِ علم کو بھی تسلی دے سکیں اور قوم کے مطالبہ کو بھی پورا کر سکیں۔ چنانچہ اسی شوق کی وجہ سے جب وحیٔ الٰہی اترتی، آپ ایک پُرشوق طالب کی طرح اس کے سیکھنے میں جلد بازی فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس بات پر متعدد جگہ آپ کو ٹوکا کہ وحیٔ الٰہی کی تکمیل کے لیے جو مدت مقرر ہے اس سے پہلے پورے قرآن کے اتار دیے جانے کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ یہ وقفہ اور انتظار تمہارے دل کو مضبوط کرنے اور تمہاری قوم کی تربیت کے لیے ہے تاکہ جو کچھ تمہیں سکھایا جا رہا ہے اس کو تم بھی برداشت کر سکو اور تمہاری قوم بھی اس میں اچھی طرح پختہ ہو جائے:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ	پس تم قرآن کے لیے، اپنی طرف اس
قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ	کی وحی پوری کیے جانے سے پہلے جلدی
وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝	نہ کرو، اور دعا کرتے رہو کہ اے میرے رب
وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ	میرے علم میں افزونی فرما۔ اور ہم نے
مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ	اس سے پہلے آدم پر ایک عہد کی ذمہ داری
نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝	ڈالی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم
(طٰہٰ - ۲۰ : ۱۱۴ - ۱۱۵)	کی پختگی نہیں پائی۔

اس آیت کے آخر میں جلد بازی سے بچنے اور تربیت کی اہمیت بھی واضح فرما دی ہے کہ انسان میں یہ فطری کمزوری ہے کہ رغبات اور خواہشوں کے مقابل میں اس کا ارادہ کمزور پڑ جایا کرتا ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس پر جو ذمہ داری ڈالی جائے اس کا پورا شعور پیدا کرنے کے لیے اس کی اچھی تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ آزمائشوں کے مقابل میں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھ سکے۔

اسی تربیت کے تقاضے سے قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے اترتا تو جلد باز مخالفین اعتراض کرتے کہ اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو جستہ جستہ کیوں اتر رہی ہے؟ خدا کا علم تو حاضر و مستقبل

سب کو گھیرے ہوئے ہے، اس کو تو نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ تجربہ کرنے کی اور نہ کسی مصلحت پر نظر رکھنے کی، پھر آخر وہ پوری کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اتار دیتا؟ یہ تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی تصنیف ہے، غور و فکر اور محنت و تجربہ کے بعد جتنی کچھ تیار کر پاتے ہیں اس کو پیش کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس اعتراض کا اثر بہت سے مسلمانوں پر بھی ہوا اور یہ بات خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر بھی گراں گزری، لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ تو مخالفین کی جلد بازی ہی کی حوصلہ افزائی فرمائی اور نہ اس غلش ہی کو کچھ اہمیت دی جو نکتہ چینوں کے اس اعتراض اور فطری شوقِ علم کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔ بلکہ فرمایا کہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تربیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے احکام تھوڑے تھوڑے کر کے ایک تدریج کے ساتھ اتریں تاکہ تمہارا دل بھی ان کے تحمل کے لیے پوری طرح مضبوط ہو جائے اور جماعت کے قوی اور ضعیف بھی ان کو اچھی طرح اپنا لیں۔ اگر جلد بازی کرو گے تو تمہاری امت میں کمزوری رہ جائے گی اور جس طرح سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہی میں ڈال دیا اسی طرح کوئی سامری تمہاری اُمت میں پیدا ہو کر اس کو گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔

جو تدریج قرآن کے نزول میں ہم پاتے ہیں بعینہٖ وہی تدریج صحابہ اور بعد کے لوگوں نے اس کے سیکھنے اور سکھانے میں ملحوظ رکھی۔ اس کی مصلحت بھی بعینہٖ وہی تھی کہ جو لوگ اس کو سیکھیں اس طرح سیکھیں کہ یہ ان کے ذہن و دماغ کے اندر بھی پیوست ہو جائے اور ان کی عملی زندگی بھی بالکل اس کے رنگ میں رنگ جائے۔ یہ بات صرف اس صورت میں ممکن تھی کہ اس کی تعلیم ایک تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ لوگوں کو دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس علم کے مطابق ان کی تربیت بھی کی جائے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:

قَالَ کَانَ الرَّجل منّا اذا تعلّم عشر
اٰیات لَمْ یجاوزھن حتّٰی
یعلم معانیھن والعمل بِھنّ۔[1]

ہم میں جو شخص دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو
جب تک ان کے علم و عمل میں اچھی
طرح پختہ نہ ہو جاتا آگے نہ بڑھتا۔

دوسرا اصول:

جماعتی تربیت کا دوسرا اصول یہ ہے کہ داعی کمیت سے زیادہ کیفیت پر نظر رکھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی پر "کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش" کا شوق اس قدر غالب ہو جایا کرتا ہے کہ وہ گلہ کی بھیڑوں سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس غفلت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تو کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں میدانوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھرا ہوتا ہے اور ادھر گلہ کی بھیڑیں یا تو بھوکوں مرنے لگ جاتی ہیں یا کوئی بھیڑیا باڑے کے اندر گھس کر ان کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔ اپنوں سے یہ بے پروائی اور بے گانوں کو اپنانے کی یہ خواہش داعیانِ حق کے اندر نہایت نیک جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان پر دعوت کا جوش اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے فرض کا احساس اس کے مقابل میں یا تو دب جاتا ہے یا کم از کم پیچھے پڑ جاتا ہے۔ وہ اس بات کو زیادہ اہمیت دینے لگ جاتے ہیں کہ جو اللہ کے باغی اور نافرمان ہیں وہ پہلے اللہ کا نام لینے والے بن جائیں، رہی ان کی تربیت و اصلاح تو یہ چیز بعد میں ہوتی رہے گی۔ بظاہر تو یہ ایک نیک خیال ہے، لیکن اگر اس کی تہ میں غور کیا جائے تو یہی اصل ہے کیفیت کے مقابل میں کمیت کو ترجیح دینے کی اور پھر آگے چل کر اسی سے یہ غلط نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ دلوں کی جگہ سروں کی تعداد گن کر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں۔

---

[1] البرھان فی علوم القرآن للزرکشی - ۲ : ص ۱۵۷

قرآن مجید نے اس غلطی سے بچانے کے لیے داعیانِ حق کو یہ تعلیم دی ہے کہ جو لوگ دعوت سے بے گانہ ہیں ان کو پکارنے اور اپنانے کی خواہش اتنی غالب نہ ہونی چاہیے کہ اس انہماک میں ان غریبوں کا حق مارا جائے جو بے چارے دعوت قبول کرکے تربیت و تزکیہ کے لیے منتظر بھی ہیں اور اس کے محتاج بھی ہیں :

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ (الحجر - ۱۵ : ۸۸)	ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو جن چیزوں سے بہرہ مند کر رکھا ہے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو اور نہ ان کی حالت پر غم کرو اور اپنی شفقت کے بازو اہلِ ایمان پر جھکائے رکھو۔
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (الکہف - ۱۸ : ۲۸)	اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جمائے رکھو جو صبح و شام اپنے رب کی رضا جوئی میں اس کو پکارتے ہیں اور تمہاری نگاہیں حیاتِ دنیا کی زینتوں کی خاطر ان سے ہٹنے نہ پائیں۔
عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ (عبس - ۸۰ : ۱ - ۶)	اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ آیا اس کے پاس نابینا اور تمہیں کیا معلوم شاید وہ اپنی اصلاح کرتا یا نصیحت سنتا تو نصیحت اس کو نفع پہنچاتی! جو بے پروائی برتتا ہے اس کے تو تم پیچھے پڑتے ہو۔

ان تمام آیات میں داعی کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ دعوت قبول کر چکے ہیں اگرچہ وہ بظاہر تعداد کے لحاظ سے کم اور حیثیت کے لحاظ سے معمولی ہوں، لیکن ان کی تربیت میں جو وقت صرف ہونا چاہیے وہ ان لوگوں کے پیچھے برباد کیا جائے جو اگرچہ شان و عظمت رکھتے ہیں اور ان کی اس شان و عظمت سے دعوت کو فائدہ پہنچنے کی بھی توقع ہو سکتی ہے، لیکن وہ گھمنڈ کے نشہ میں سرشار اور دعوت سے بیزار ہیں۔

تیسرا اصول:

جماعتی تربیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جماعت جن اصولوں پر بنی ہے جماعت کے کسی گوشہ میں ان سے انحراف یا بغاوت کی بیماری نہ پھیلنے دی جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی فتنہ سر اٹھاتا نظر آئے تو جماعت کے رہنماؤں اور اربابِ کار کا فرض ہے کہ اس کے پھیلنے سے پہلے اس کے قلع قمع کی فکر کریں۔ اور اس فرض کی ادائیگی میں نہ مصلحت بینی مانع ہو نہ رواداری، نہ کسی کا خوف اور نہ کسی کی محبت۔ اس امر میں معمولی غفلت کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ظاہر ہوا کہ قوم کا ایک بڑا حصہ خدا پرستی کی جگہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ اس قسم کے فتنوں کی سرکوبی کے لیے جماعت کے لیڈروں کو نہ صرف قوی دل ہونا چاہیے، بلکہ کچھ مضائقہ نہیں کہ اگر وہ سخت دل بھی ہوں تاکہ بالکل بے مروّت ہو کر ان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کے اندر جب شرک کے فتنہ کے پھوٹ پڑنے کی اطلاع ہوئی تو طور سے واپس آکر انہوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کو نہایت سختی سے ڈانٹا جو ان کی غیر موجودگی میں قوم کی نگرانی کے ذمہ دار تھے اور جن کی مروّت یا رواداری کی وجہ سے اس خرابی کو پھیلنے کا موقع ملا۔ پھر انہوں نے اصلی مجرموں کو خود ان کے قبیلہ کے لوگوں کے ہاتھوں قتل کرا دیا تاکہ ہر شخص پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ جماعت کے اندر اس قسم کے فتنے پھیلائیں

گے وہ ان لوگوں کی طرف سے بھی کسی رحم وکرم یا رواداری کی امید نہیں کر سکتے جن کے ساتھ وہ خون اور نسب کے قریبی رشتے رکھتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس بت کو بھی ریزہ ریزہ کر کے ناپید کر دیا جو سامری نے بنایا تھا تاکہ اس فتنہ کا کوئی ادنیٰ نشان بھی قوم میں باقی نہ رہے اور خود سامری کو تو ایسی عبرت انگیز سزا دی جو اس کے ساتھ زندگی بھر کے لیے چمٹ گئی۔

جماعت کو اس قسم کی خرابیوں سے پاک رکھنے کے لیے اسلام نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ جب جماعت کے بعض افراد میں جماعتی اصولوں سے کوئی انحراف پایا جائے تو پوری جماعت کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام اور اصلاح کے لیے کوشش کرے۔ اگر جماعت ایسا نہ کرے، بلکہ افراد کو چھوڑ دے کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے رہیں تو ان کے جرم کا وبال صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا، بلکہ جماعت کے فاسق اور متقی سب اس میں حصہ پاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی حقیقت کشتی کی مثال دے کر سمجھائی ہے کہ اگر ایک کشتی کے مسافر اس شخص کا ہاتھ نہ پکڑیں جو کشتی کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کشتی ڈوبے گی اور ایک شخص کی شرارت کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی۔ اسی طرح اگر ایک جماعت اپنے اندر کے شریروں سے رواداری برتتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ شریر جو آفت ڈھائیں اس میں بلا استثناء پوری جماعت مبتلا ہو۔ قرآن مجید نے اس خطرہ سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا ہے:

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ (الانفال - ۸ : ۲۵)	اور بچتے رہو اس فتنہ سے جو مخصوص طور پر انہی لوگوں کو نہیں لاحق ہوگا جنہوں نے جرم کا ارتکاب کیا ہوگا اور جان رکھو کہ اللہ سخت پاداش والا ہے۔

اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جماعت کے مختلف مدارج کے لحاظ سے طریق کار مختلف ہوگا، لیکن نفسِ فرض سے جماعت کسی حال میں بھی بری الذمہ نہیں ہوتی۔ ابتدائی مرحلہ میں جب جماعت کو کوئی سیاسی طاقت حاصل نہیں ہوتی، صرف جماعت کا مزاج ان لوگوں کو اپنے اندر سے چھانٹ کر الگ کرتا رہتا ہے جو اس کے اصولوں سے انحراف کرتے ہیں۔ وہ اوّلاً تو ان لوگوں کو اپنے اندر جگہ ہی نہیں دیتی جو اس کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے نہ ہوں اور اگر اس قسم کے خام لوگ اس کے اندر کسی طرح گھس بھی آتے ہیں تو جس طرح ایک سلیم المزاج آدمی کے معدہ کے اندر مکھی قرار نہیں پکڑتی اسی طرح اس قسم کے لوگ اس نظام کے اندر نہیں ٹکتے۔ اگر اس پہلے ہی مرحلہ میں کسی جماعت کا یہ حال ہو کہ اس کے اصولوں سے انحراف کرنے والے اس کے اندر آسانی سے پرورش پا سکتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جماعت کا کوئی مزاج ہی نہیں بنا ہے اور وہ بہت جلد منتشر ہو کے رہے گی۔ دوسرے مرحلے میں، یعنی جب جماعت کو سیاسی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، جماعت کا سیاسی ادارہ اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ اس کے اندر فاسد عناصر پیدا ہونے یا گھسنے نہ پائیں۔ وہ اس کی روک تھام کے لیے عام تبلیغی و تعلیمی وسائل کے ساتھ اگر ضرورت سمجھتا ہے تو طاقت کو بھی استعمال کرتا ہے۔ یہ سیاسی ادارہ اگر پوری فرض شناسی کے ساتھ اپنی ذمہ داری ادا کرتا رہے تو پوری جماعت ذمہ داری سے بری رہتی ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ یہ جگہ جائے تو پوری جماعت کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علم لے کر اٹھے اور جب تک اس کی اصلاح نہ کر لے چین کی نیند نہ سوئے۔ اس دعوتِ اصلاح کی حد قرآن مجید نے یہ معین کی ہے کہ داعیانِ اصلاح صرف صدائے اصلاح پر قانع نہ ہو جائیں، بلکہ مجرمین کے طرزِ عمل سے اظہارِ بیزاری کر کے ان کے جرائم سے اپنے آپ کو عملاً علیحدہ بھی کر لیں۔

چوتھا اصول :

جماعتی تربیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ ابتدائے دعوت میں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو تعلیم و دعوت کے اصل مرکز سے وابستہ رہنے کی تاکید بھی کی جائے اور اس کا سامان بھی بہم پہنچایا جائے۔ جس دور میں جماعت کا مزاج ابھی بن رہا ہو اس دور میں مناسب ماحول اور اصل مرکز سے براہِ راست وابستگی صحیح تربیت کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں۔ اس دور میں اگر ان دونوں چیزوں سے غفلت کی جائے تو جماعت کے اندر ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو عقلی اور اخلاقی، دونوں پہلوؤں سے اتنے مضبوط ہوں کہ اپنے آپ کو بھی دعوت کے اصلی رنگ میں رنگ لیں اور دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگ سکیں۔ بلکہ اس کے برعکس بیشتر ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جن پر دعوت کا رنگ ایسا ہلکا ہوتا ہے کہ آزمائش کی ایک ہی بھٹی سے گزرنے کے بعد اڑ جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ نہ فہم کے اعتبار سے اتنے پختہ ہوتے ہیں کہ دوسروں کے اندر دعوت کا صحیح شعور پیدا کر سکیں، نہ سیرت کے لحاظ سے اتنے مضبوط ہوتے کہ ہر طرح کے موافق و ناموافق حالات کے اندر اس دعوت کو جاری رکھ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک کوئی مؤثر شخصیت موجود ہوتی ہے، لوگوں کے اندر اس دعوت کا چرچا موجود رہتا ہے، لیکن جونہی وہ سامنے سے ہٹی سارا ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ اسلام میں ہجرت کا جو حکم دیا گیا اس کے اندر جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی تھی کہ تمام مسلمان براہِ راست حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے فائدہ اٹھائیں اور ایک سازگار ماحول میں رہ کر اسلام کا رنگ ان پر اچھی طرح چڑھا جائے۔ جہاں یہ بات ممکن نہ ہو کہ ہر شخص اصل مرکزِ تعلیم و دعوت سے براہِ راست فائدہ اٹھا سکے وہاں دعوتِ اسلامی کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے ذہین اور صالح اشخاص کی ٹولیاں مرکز کی تعلیم و دعوت سے استفادہ کے لیے نکلیں اور

دین کا فہم حاصل کرنے کے بعد جب اپنی قوم میں لوٹیں تو ان کو دین سے باخبر کریں :

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِن كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ ۝

(التوبة - ٩ : ١٢٢)

یہ تو نہ تھا کہ سب ہی مسلمان اٹھتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں بصیرت حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو بھی آگاہ کرتے جب کہ وہ ان کی طرف لوٹتے کہ وہ بھی احتیاط کرنے والے بنتے۔

پانچواں اصول :

جماعتی تربیت کا پانچواں اصول یہ ہے کہ جماعت کے سامنے آزمائش کے جو مواقع آئیں ان میں جماعت کی غلطیوں اور خامیوں پر پوری نظر رکھی جائے اور جب وہ آزمائش کا وقت گزر جائے ، اطمینان کا سانس لینے کا موقع میسر آجائے تو ان میں سے ہر غلطی اور خامی پر بے رُو رعایت تنقید کی جائے اور یہ عقلی کمزوریاں جن اضافی خامیوں کی غمازی کرتی ہوں ان کو پوری وضاحت کے ساتھ کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا جائے۔ شروع شروع میں اس تنقید کا خطاب عام ہونا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص اس تنقید سے متنبہ ہوگا اور اگر طبیعت میں صلاحیت ہوگی تو اس سے فائدہ بھی اٹھائے گا۔ پہلے ہی مرحلہ میں متعین طور پر صرف غلط کاروں کو نام بنام ملامت کرنے سے ان کو اپنی رسوائی کا احساس ہوتا ہے جس سے ان کے اندر اصلاحِ حال کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ جب کسی گروہ کے متعلق بار بار کے تجربہ کے بعد بھی یہی ثابت ہو کہ وہ جماعت کے اصولوں سے صرف کسی ذہنی الجھن کی وجہ سے یا

محض اتفاقی طور پر انحراف نہیں کر رہا ہے، بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ اس نے منافقت ہی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے تو اس کو براہِ راست اس کی غلطیوں پر متنبہ کرنا چاہیے اور پردہ داری اور رواداری کا طریقہ بدل دینا چاہیے۔ اس گروہ کو یہ آخری تنبیہ ہوگی۔ اس کے بعد بھی اگر یہ گروہ اپنی اصلاح نہ کرے تو پھر جماعت کا فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اپنے اندر سے بالکل کاٹ پھینکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ساتھ یہی طریقہ اختیار فرمایا، اور یہی طریقہ جماعتی تربیت کے لیے عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ جو لوگ قرآن مجید پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں بدر کی لڑائی وہ پہلا آزمائشی موقع ہے جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلامی جماعت کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اندر کچھ جراثیم نفاق کے چھپائے ہوئے ہیں۔ جنگ کے حالات گزرنے کے بعد قرآن نے ان لوگوں کے طرزِ عمل پر نہایت سختی سے تنقید کی جس کی شہادت سورۂ انفال سے مل رہی ہے۔ لیکن اس وقت نہ تو تعین کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے انہیں رسوا کیا گیا اور نہ ان کو جماعت ہی سے الگ کیا گیا۔ اس کے بعد ہر آزمائش کے موقعہ پر یہ گروہ اپنی کمزوریاں ظاہر کرتا رہا، لیکن عام تنقید و نصیحت کے سوا قرآن نے ان پر براہِ راست کوئی ضرب نہیں لگائی۔ تقریباً معرکۂ تبوک تک یہی صورتِ حال قائم رہی۔ لیکن جب ان لوگوں پر اچھی طرح حجت تمام ہوگئی اور یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان لوگوں کی شرارتیں کسی بے علمی یا اتفاقی مغلوب الحالی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے کر رہے ہیں تو پھر یہ لوگ جماعت کے اندر سے کاٹ کر علیحدہ کر دیے گئے۔

داعیٔ حق کی ذمّہ داری

داعیٔ حق ہو یا داعیٔ ضلالت، دونوں میں سے کسی کو بھی اللہ تعالیٰ نے دعوت اور ترغیب سے زیادہ کسی چیز کا اختیار نہیں بخشا ہے نہ پیغمبروں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کے دل میں ہدایت ڈال دیں اور نہ شیطان ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کو گمراہی کی راہ پر لگا دے۔ ان میں سے ہر ایک کو بس یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ اپنی اپنی راہ کی طرف خلقِ خدا کو بلا سکتے ہیں۔ ہدایت یا ضلالت کو اختیار کرنا، اختیار کرنے والے کی اپنی پسند اور اللہ تعالیٰ کی خاص توفیقِ تیسیر پر منحصر ہے۔ اس توفیق اور تیسیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک ضابطہ بنا دیا ہے جس کے مطابق وہ اپنے سلیم الفطرت اور ہدایت پسند بندوں کو نبیوں کے رستہ پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور کجروی اور گمراہی کو پسند کرنے والوں کے لیے شیطان کے راستوں پر چلنا آسان کر دیتا ہے۔ یہی حقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان آیات میں واضح کی گئی ہے:

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ	تم جن کو چاہو، ہدایت نہیں دے
وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ۚ	سکتے، بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے
(القصص - ۲۸ : ۵۶)	ہدایت دیتا ہے۔
وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ	اور ان لوگوں میں سے اکثر ایمان لانے

حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝
(یوسف - ۱۲ : ۱۰۳)

والے نہیں ہیں خواہ تم ان کے ایمان کی کتنی ہی حرص کرو۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝
(النحل - ۱۶ : ۳۷)

اگر تم ان کی ہدایت کے حریص ہو تو اللہ ایسوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا جن کو گمراہ کر دیتا ہے اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ
(ابراھیم - ۱۴ : ۱)

یہ کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اس لیے اتاری ہے کہ تم لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاؤ، ان کے رب کے اذن سے۔

اسی طرح ابلیس کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝
(الحجر - ۱۵ : ۴۲)

میرے بندوں پر تیرا کوئی زور نہیں چلے گا۔ بجز ان کے جو گمراہوں میں سے تیرے پیرو بن جائیں۔

خود ابلیس کی زبان سے اس کا یہ اعتراف نقل کیا ہے:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ
(ابراھیم - ۱۴ : ۲۲)

اور مجھے تم پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ بس میں نے تمہیں دعوت دی اور تم نے میری بات مان لی تو مجھے ملامت نہ کرنا اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

اس امرِ واقعی کی وجہ سے جہاں تک ایک داعیٔ حق کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر بالکل غور نہیں کرتا اور نہ اسے غور کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی دعوت پر کان دھریں گے یا نہیں اور نہ اس فکر میں وہ سر کھپاتا اور نہ اس کو سر کھپانا چاہیے کہ زمانہ اس کی دعوت کے لیے سازگار ہے یا ناسازگار۔ وہ لوگوں کے ردّ و قبول، اپنی کوششوں کی کامیابی اور ناکامی اور دعوتِ حق کے انجام کے متعلق ایک بار یہ فیصلہ کر کے کہ اس امر کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، بالکل مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اس بات پر غور کرتا ہے کہ خود اس کا اپنا فرض کیا ہے اور جب یہ طے کر لیتا ہے کہ وہ اس مقصد کی دعوت دے جس کو وہ حق یقین کر رہا ہے اور جو اس کے خیال میں تمام دنیا کے لیے یکساں مفید ہے، تو یہ طے کر چکنے کے بعد وہ اس تردد میں نہیں پڑتا کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کرنے کے بارہ میں اپنا فرض پورا کریں گے یا نہیں اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو دنیا میں برپا کرے گا یا نہیں۔

جہاں تک لوگوں کے ردّ و قبول کا تعلق ہے وہ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں، دونوں صورتوں میں اس کی اپنی ذمہ داری بدستور قائم رہتی ہے۔ اگر وہ قبول کریں گے تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کی راہیں کھلیں گی اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ادائے فرض و دعوت کا اجر و ثواب حاصل کرے گا، اور اگر نہ قبول کریں گے تو اس کے ذریعے سے لوگوں پر خدا کی حجت پوری ہو گی اور داعی اللہ کے ہاں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش قرار دیا جائے گا کہ اس کا جو فرض تھا اس نے پورا کر دیا۔ قرآن میں داعیانِ حق کی ایک جماعت کا جواب نقل ہوا ہے جن کو ان لوگوں کے سامنے بے فائدہ اپنی دعوت پیش کرنے سے روکا گیا تھا جو دعوت کو قبول کرنے والے نہیں تھے۔ اس جواب سے داعیٔ حق کے فرض کی نوعیت واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول

کریں یا نہ کریں، دونوں صورتوں میں اس کا فرض صرف حق کی دعوت دیتے رہنا ہے۔ اگر لوگ قبول کریں گے تو ہدایت پائیں گے اور اگر نہ قبول کریں گے تو یا اللہ کے ہاں بری الذمہ قرار پائے گا:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ (الاعراف - ۷ : ۱۶۴)	اور یاد کرو جب کہ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کیے جا رہے ہو، جنہیں یا تو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا انہیں ایک سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہ بولے کہ یہ اس لیے کہ یہ تمہارے رب کے سامنے ہماری طرف سے عذر بن سکے اور تاکہ یہ خدا کے غضب سے بچیں۔

باقی رہا اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کا معاملہ تو مجرد یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس حق کو واضح کیا ہے، اس کے دل کے اندر یہ اطمینان پیدا کرتی ہے کہ اس حق کی دعوت دینا، لوگوں کے لیے اس کا قبول کرنا اور دنیا میں اس کا فروغ پانا ممکن ہے اور اگر وہ اس کی طرف لوگوں کو بلانے اور دنیا میں اس کا برپا کرنے کا عزم لے کر اٹھے گا تو اللہ ضرور اس کام میں اس کی امداد فرمائے گا۔ ایک رحیم و کریم خدا کے متعلق وہ یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ جس راستہ کی طرف وہ رہبری کرے کہ یہ صراطِ مستقیم ہے اس راستہ پر چلنا ناممکن ہو اور جس نظامِ زندگی کی بابت وہ فرمائے کہ یہ فطری نظامِ زندگی ہے وہ اتنا پیچیدہ اور ناممکن العمل ہو کہ لوگ اس کو اختیار ہی نہ کر سکیں۔ نیز ایک عادل اور مہربان پروردگار کے متعلق وہ یہ بدگمانی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس پر ایک فرض عائد کرکے یہ حکم دے کہ تیرے کرنے کا کام یہ ہے اور اسی کے کرنے میں تیری نجات اور میری خوشنودی ہے، لیکن جب وہ اس کو کرنا شروع کرے اور اس کے سامنے مشکلیں آئیں

تو وہ اس کو تنہا بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اس کی کوئی مدد نہ فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ حسنِ ظن اور یہ اعتماد ہر داعیِ حق کے اندر موجود ہوتا ہے اور مخالفین جب اس کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کرتے ہیں اور بظاہر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کام اب آگے نہیں بڑھنے کا ہے تو یہی اعتماد اس کی ڈھارس بندھاتا ہے کہ جس راستہ کی طرف خود خدا نے انگلی اٹھا کر اشارہ فرمایا ہے کہ راہِ حق یہ ہے تو اس پر چلنے والا منزلِ مقصود تک ضرور پہنچ کر رہے گا اور اس راہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، لیکن بالآخر اللہ کی مدد ضرور آ کے رہے گی۔ داعیانِ حق کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہی تعلق اور اعتماد ہے جو سورۂ ابراہیم کی اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے:

وَ مَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى	اور ہم کیوں نہ اللہ پر بھروسہ رکھیں جبکہ
اللّٰهِ وَ قَدْ هَدٰىنَا سُبُلَنَا ؕ	اس نے ہمیں ہمارے راستوں کی ہدایت
وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ	بخشی اور تم ہمیں جو ایذا بھی پہنچاؤ گے
وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	ہم اس پر صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے
الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝	والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

(ابراھیم - ۱۴ : ۱۲)

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی اپنی ذمہ داری کے حدود معین کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس پر صرف اسی حد تک ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ حق کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دے، بلکہ وہ اس بات کا بھی ذمہ دار ہے کہ لوگ اس حق کو قبول بھی کر لیں۔ اس غلطی کا لازمی نتیجہ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ داعی کے اندر حقِ خالص کو پیش کرنے کی بجائے مخالفین کے باطل عقائد و افکار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل غلط ذمہ داری اپنے سر اٹھا لینے کی وجہ سے اپنی زندگی سخت افکار اور الجھنوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس

طرح کی غلطیوں سے بچانے کے لیے قرآن مجید نے مفصل ہدایات دی ہیں مثلاً:

وَمَا عَلَى الَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِنْ شَيْءٍ وَلَكِنْ ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۝ (الانعام - ٦ : ٦٩)

جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان پر ان لوگوں کے حساب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ بس یاد دہانی کر دینا ہے تاکہ وہ بھی ڈریں۔

اِتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ۝ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكُوا وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ۝ (الانعام - ٦ : ١٠٦ - ١٠٧)

تم بس اس چیز کی پیروی کرو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر وحی کی جارہی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور مشرکوں سے اعراض کرو۔ اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کرپاتے۔ (لیکن اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملے میں زبردستی نہیں کی ہے) اور ہم نے تم کو ان پر نگران نہیں مقرر کیا ہے (کہ یہ کوئی غلطی نہ کرنے پائیں) اور نہ تم ان کے ضامن ہو (کہ ان کے ایمان کے معاملہ کی ذمہ داری تم پر ہو۔)

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (الرعد - ١٣ : ٤٠)

پس تمہارے اوپر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے۔

طٰهٰ ۝ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقَىٰ ۝ إِلَّا تَذْكِرَةً لِمَنْ يَخْشَىٰ ۝ (طٰهٰ - ٢٠ : ١ - ٣)

یہ سورہ طٰہٰ ہے۔ ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اتارا ہے کہ تم مصیبت میں پھنس جاؤ۔ یہ تو بس ان لوگوں کے لیے یاد دہانی ہے جو خدا سے ڈریں۔

اس زمانہ میں جو لوگ طاغوت کے عالمگیر تسلط کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور دعوتِ حق کا کوئی امکان نہیں پا رہے ہیں یا دعوتِ حق کے پھیلنے کا امکان نہ پاکر دعوتِ باطل ہی میں لگ گئے ہیں، یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ ان لوگوں کے سامنے اگر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ ان کی ذمہ داری صرف ابلاغ ہے؛ لوگوں کا ان کی پیش کی ہوئی دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اور اس دعوت کا فروغ پانا یا نہ پانا ان سے متعلق نہیں ہے، بلکہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ سے متعلق ہے تو نہ وہ امکان اور عدم امکان کی الجھنوں میں پڑتے اور نہ وہ ایک باطل کو برپا کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے، بلکہ اپنے بس بھر حق کی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے کہ جب وہ خود حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے تو اس حق کو ضرور برپا کرے گا جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری بھی اپنے کاندھوں پر اٹھا لینی چاہی اور جب انہیں اندازہ ہوا کہ یہ بوجھ بھاری ہے، ان سے نہیں اٹھ سکے گا تو مجبوراً ان کو یہ اعلان بھی کرنا پڑا کہ ہر چند خیر و برکت والا نظام تو وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، لیکن اس زمانے میں اس کا وسیع پیمانہ پر قیام چونکہ ناممکن ہے، اس وجہ سے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک غیر اسلامی نظام ہی کی دعوت دی جائے اور اسی کو قبول کر لیا جائے۔

اس خیال کے اندر جو گمراہیاں چھپی ہوئی ہیں، ان سب کو نہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ان کے ظاہر کرنے کی یہاں گنجائش ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے دیدہ و دانستہ حق کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ محض اس خیال سے اختیار کی کہ اس راہ پر چل کر وہ بزعم خود آسانی سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، حالانکہ اس راہ میں بھی کامیابی ——— جس کو وہ کامیابی سمجھتے ہیں ——— اگر حاصل ہوگی تو اللہ کے حکم ہی سے حاصل ہوگی نہ کہ خود ان کی سعی و تدبیر سے۔ تو بجائے

اس کے کہ وہ ایک باطل راہ پر چل کر اس بات کا انتظار کرتے کہ اللہ تعالیٰ اس راہ میں ان کی رسی دراز کرے، کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ خود بھی راہِ حق پر چلتے۔ اور اسی پر چلنے کی دوسروں کو بھی دعوت دیتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق اور کامیابی کے منتظر رہتے۔

یہ خطرناک غلطی جس نے ان کی ساری جدوجہد کو ایک بالکل غلط راہ پر لگا دیا، صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ بحیثیتِ داعی انہوں نے اپنی ذمہ داری کے حدود کو ٹھیک ٹھیک معین نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا فرض صرف اسی قدر نہیں سمجھا کہ جس حق کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی ہے اس حق کو بلا کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیں، بلکہ اپنا فرض یہ بھی سمجھا کہ لوگوں کو اس کا معتقد بھی بنا دیں اور جب یہ کام انہیں بہت مشکل نظر آیا تو انہوں نے حق کو چھوڑ کر باطل ہی کو اختیار کر لیا کہ لوگ آسانی سے اس کے معتقد بن سکیں گے۔ یہ غلطی لازمی طور پر ایک داعی کو رحمان کے راستہ سے ہٹا کر شیطان کے راستہ پر ڈال دیتی ہے اور وہ صرف داعی ہی نہیں رہ جاتا، بلکہ مدعی بن کر خدا کے حقوق میں دراندازی کرنے والا اور ایک نیا دین پیش کرنے والا بن جاتا ہے۔

ایک داعی اگر اپنی حیثیت کو اچھی طرح پہچانتا ہے تو اس سے اس بات کا اندیشہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مایوس اور بددل ہو کر بیٹھ رہے یا حق کی جگہ باطل ہی کی دعوت شروع کر دے، البتہ اس کو اس پہلو سے اپنی نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں اس خیال کی وجہ سے کہ اس کے اوپر صرف بلاغ ہی کی ذمہ داری ہے، اس کے اندر بے پروائی اور سہل انگاری نہ پیدا ہو جائے۔ اپنے آپ کو اس چیز سے بچانے کے لیے اس کو ہمیشہ ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے جو داعی پر بحیثیتِ داعی عائد ہوتی ہیں اور جن کا لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس سے مواخذہ ہو جاوے کہ اس نے تبلیغ یا ادائے شہادت کا فرض اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح اس کو ادا کرنے کا حق تھا۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا جہاں تک تعلق ہے ان کو فرض رسالت کی ذمہ داریاں

کا اس درجہ شدید احساس ہوتا تھا کہ بسا اوقات خدا اپنے ضروری آرام کا خیال کرتے نہ اپنی اور اپنی دعوت کی عزت و شان کا۔ بلکہ ان کے غیر معمولی انہماک سے ایسا ظاہر ہوتا کہ گویا وہ اپنے آپ کو لوگوں کے کفر و ایمان کا ذمہ دار سمجھ رہے ہیں۔ اس انہماک پر اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو محبت آمیز انداز میں ٹوکا ہے جس کی بعض مثالیں ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہی انہماک، افراط و تفریط سے بچ کر، ہر داعیٔ حق کی خصوصیت ہونا چاہیے۔

باب ۱۲

دعوتِ حق کے مخالفین

ہر دعوتِ حق کو عموماً تین طرح کے مخالفین سے سابقہ پڑتا ہے :

۱. معاندین ؛

۲. متربصین ؛

۳. منافقین ۔

ان میں سے ہر گروہ کی خصوصیات وصفات اور ان کی نفسیات الگ الگ ہیں، اس وجہ سے ایک حکیم داعی کو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بالکل علیحدہ علیحدہ معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ اور بہت بڑی حد تک دعوت کی کامیابی کا انحصار اسی فرقِ معاملہ پر ہے۔ اگر ایک داعی ان مختلف جماعتوں کو امتیاز کرنے اور ان کے مخصوص محرکات و میلانات کے پہچاننے سے قاصر رہ جائے تو اس کی دعوت کا کامیابی سے ہمکنار ہونا مشکل ہے۔ مسئلہ کی اس اہمیت کی وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام جماعتوں کی امتیازی خصوصیات اور ان کے ذہنی میلانات کی تشریح کریں۔

معاندین :

معاندین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوت کے اثر کا اندازہ کرتے ہی اس کی مخالفت

کے لیے خم ٹھونک کر، میدان میں اتر آتا ہے۔ ان کی مخالفت کی تہ میں یوں تو مختلف قسم کے محرکات کام کرتے ہیں، لیکن تین محرک اصلی اور بنیادی ہیں۔ ایک حمیتِ جاہلیت، دوسرا استکبار اور حسد، اور تیسرا مفاد پرستی۔ یہ تینوں محرکات حق کی مخالفت میں پیش قدمی کے اعتبار سے تو بالکل یکساں نوعیت کے ہیں، لیکن اپنی روح کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔

حمیتِ جاہلیت کی بیماری درحقیقت نظامِ جاہلی کے ساتھ اخلاص و وفاداری کا نتیجہ ہے۔ اس بیماری میں بالعموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اپنے عہد کے نظامِ جاہلی کے مخلص اور وفادار خادم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوت ایسی اٹھ رہی ہے جو اس نظام کو جس کے وہ علمبردار ہیں، توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام برپا کرنا چاہتی ہے تو ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ ان کو اس میں اپنی قوم کی سیاسی و معاشی تباہی نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے ان کے قبیلہ میں پھوٹ پڑ رہی ہے اور ان کی بنی ہوئی جمعیت منتشر ہوئی جا رہی ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ دعوت باپ دادا کے معروف طریقہ اور پرانی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ اس وجہ سے ان کا دل اس سے کڑھتا ہے۔ یہ ساری باتیں مل ملا کر ان کے اندر داعی اور دعوت کے خلاف ایک سخت قسم کا غم و غصہ پیدا کر دیتی ہیں اور وہ پورے جوش کے ساتھ اس مخالفت میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی یہ مخالفت بیشتر قومی اخلاص پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے اس میں کمینہ پن اور رذالت کا شائبہ کم ہوتا ہے۔ یہ ایک مردانہ مخالفت ہوتی ہے جس میں جوش تو ہوتا ہے، لیکن یہ جوش شرافت سے عاری نہیں ہوتا۔ اس طرح کی مخالفت میں اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ غلط فہمیاں رفع ہونے کے بعد یہ عداوت محبت سے بدل جائے اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ محبت بھی ویسی ہی پُرجوش اور طاقتور ہوتی ہے جیسی پرجوش اور طاقتور عداوت ہوتی ہے۔ اسلامی دعوت

کی تاریخ میں اس کی بہترین مثال ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہے۔ ابوجہل دعوتِ اسلام کی مخالفت میں آخر دم تک جس درجہ سرگرم رہا ہر شخص کو معلوم ہے، لیکن اس شدید عناد کے باوجود اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی رکیک الزام لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جب آپ دعوت کے لیے نکلتے تو جوشِ مخالفت میں سایہ کی طرح آپ کے ساتھ ساتھ ہوتا تاکہ کوئی آپ کی بات سننے نہ پائے۔ لیکن جب مخالفت کرتا تو اس کا یہ انداز ہوتا کہ "اے محمد! میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو لیکن تمہاری دعوت باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے"۔ اس کو سب سے زیادہ غصہ اس بات پر تھا کہ اسلامی دعوت قریش کی جمعیت کو پارہ پارہ کر رہی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے بڑا الزام جو وہ لگاتا تھا وہ یہ تھا کہ آپ نے بیٹے کو باپ سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر کے ان کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ چنانچہ بدر کے معرکے کے موقع پر جب اس نے دیکھا کہ اسلامی دعوت نے قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے، تو اس نے پورے جوش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی: اَللّٰھُمَّ اقطعنا للرحم، وآتانا بمالا یعرف، فاحنہ الغداۃ[1] (اے خدا! ہم میں جو سب سے زیادہ رشتۂ رحم کا توڑنے والا اور اس بدعت کا باعث ہوا ہو اس کو کل شکست دیجیو!) یہ دعا اگرچہ حمیتِ جاہلیت کے زہر میں بجھی ہوئی ہے، لیکن اس میں ابوجہل کی شرافتِ نفس اور قوم پرستی کا جو پہلو نمایاں ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے مخالفین اگرچہ دعوت کی مخالفت میں کتنے ہی سرگرم ہوں، اپنے اندر ایک جوہر قوم پرستی کا رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک داعیٔ حق کی نظروں میں ان کی ایک خاص وقعت ہوتی ہے اور وہ اس بات کا دل سے آرزو مند ہوتا ہے کہ ان کا یہ جوہر باطل کی جگہ حق کی خدمت میں استعمال ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ

---

[1] السیرۃ النبویۃ لابن ہشام۔ القسم الاول، ص ۶۶۸

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلامی کے تمام مخالفین میں سے خصوصیت کے ساتھ ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کے لیے دعا کی تاکہ ان کے قبولِ اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت و عزت حاصل ہو۔ آپ کی یہ دعا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارہ میں قبول ہوئی اور اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان کے اسلام لاتے ہی دفعتہً حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔ قبولِ اسلام سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جس جوش، جس سرگرمی اور جس ہمت و حمیت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کر رہے تھے، اسلام لانے کے بعد اس سے کہیں زیادہ اولوالعزمی اور مردانگی کے ساتھ اسلام کے لیے جاں نثاریاں کرنے لگے۔ ان کی جاہلی حمیت کے اسلامی رنگ اختیار کرتے ہی دوست دشمن ہر شخص کو محسوس ہونے لگا کہ اب اسلام کی صف میں ایک شیر دل مردِ حق آگیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سیرت کے اندر وہ جوہر موجود تھا جو انسان کی تمام اعلیٰ صفات کے لیے خمیر کا کام دے سکتا ہے، لیکن یہ جوہر بہت سے جاہلی تصورات کے نیچے دبا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کی رگڑ سے جب ان باطل تصورات کا میل اڑ گیا تو نیچے سے وہ کھرا سونا صاف نکل آیا جس کی چمک نے بالآخر دنیا کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔ اپنے عہد کے نظامِ جاہلی کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وابستگی خود غرضی اور مفاد پرستانہ نہیں تھی، بلکہ اسلام لانے سے پہلے سے اسی نظامِ جاہلی کو وہ حق سمجھتے تھے، اسی کو اپنے مقدس باپ دادا کا ورثہ خیال کرتے تھے، اسی کے اندر اپنی قومی عزت کا بقا سمجھتے تھے اور ان تمام وجوہ سے وہ اپنا یہ دینی اور قومی فرض سمجھتے تھے کہ اس کے سبھی خواہوں کے سبھی خواہ اور اس کے مخالفوں کے دشمن ہوں۔ لیکن جب ان پر یہ بات واضح ہو گئی کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہے ہیں، بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے تو اسی جذبہ نے، جو ان کو نظامِ جاہلی کا پُرجوش خادم بنائے ہوئے تھا، ان کو اسلام کی خدمت و اعانت کے لیے سرگرم کر دیا۔ اس طرح کی سیرت رکھنے والے اشخاص ادنیٰ درجہ کی خود غرضیوں سے بالاتر ہونے کی وجہ سے

نہ تو کسی حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اس کے انکار پر اڑتے اور نہ کسی چیز کو اختیار کر لینے کے بعد اس کے واجبی حقوق اور مطالبات ادا کرنے سے جی چراتے، بلکہ ایک امر کے حق ثابت ہو جانے کے بعد اس کو قبول کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں اور اس کے لیے اپنے ہر طرح کے ذاتی مفاد قربان بھی کر سکتے ہیں۔ ان کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں اپنا ایک خاص درجہ اور مقام رکھتے ہیں۔ اس گروہ میں مختلف ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کی حمیت اپنے حدود سے گزر کر نفسانیت اور خود پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور ان کو آخر دم تک جاہلیت کے پھندے سے نکلنا نصیب ہی نہیں ہوتا، جیسے ابوجہل۔ بعض تھوڑی سی کشمکش کے بعد کسی معمولی سی تنبیہ سے متنبہ ہو کر راہِ حق پا لیتے ہیں، جیسے حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما۔ بعض جاہلیت کے غلاف سے نکلنے میں بڑی دیر لگاتے ہیں، جیسے ابوسفیانؓ۔ لیکن ایک وصف ان سب میں مشترک ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب یہ جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام اختیار کرتے ہیں تو آتے ہی اسلام کی صفِ اوّل میں اپنی جگہ اسی طرح بنا لیتے ہیں جس طرح کل تک وہ جاہلیت کی صفِ اوّل میں تھے: خیارھم فی الجاھلیۃ خیارھم فی الاسلام[1] (ان میں سے جو لوگ جاہلیت میں بہترین تھے وہ اسلام کے زمانہ میں بھی بہترین ہیں)۔

استکبار اور حسد کی وجہ سے دعوتِ حق کی مخالفت بالعموم وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنی دینداری یا موروثی مالداری کی وجہ سے نظامِ جاہلی کے اندر پیشوائی اور سرداری کے مقام پر متمکن ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آگے چلتے رہنے کی وجہ سے آگے چلنے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ حق کے پیچھے چلنے میں بھی انہیں عار محسوس ہوتا ہے اور وہ بجائے اس کے کہ حق کے پیچھے چلیں، کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ حق کو اپنے پیچھے چلائیں۔ موروثی دینداری

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الانبیاء، باب ۵۴

کی ذہنیت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو اپنے باپ دادا کی میراث اور اپنی ذاتی جائیداد خیال کرنے لگ جاتے ہیں اور عقیدت و احترام کے ماحول میں پلنے بڑھنے کی وجہ سے وہ اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حق ان کی ذات اور ان کے حلقہ سے باہر بھی پایا جا سکتا ہے۔ موروثی مالداروں کا حال یہ ہے کہ وہ دنیوی شان و عظمت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرا لیتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ جب انہیں عزت و عظمت حاصل ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ انہی کا فکر اور انہی کا عمل حق بھی ہے۔ اس طرح کی ذہنیت کے لوگوں کو جب کوئی ایسی دعوت چیلنج کرتی ہے جو ان کی روایتی دینداری کے خلاف ہوتی ہے یا جس کی زد ان کی خواہشوں پر پڑتی ہے تو یہ طبقہ اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس صورت میں ان کی مخالفت بہت ہی سخت و شدید ہو جاتی ہے جب یہ دعوت ان کے حلقہ کے سوا کسی اور حلقہ سے بلند ہوتی ہو۔ یہ لوگ اس غرور میں مبتلا ہوتے ہیں کہ حق ہمارے ساتھ ہے اور ہمیشہ ہمارے ہی ساتھ رہے گا۔ اور اگر بالفرض ہمارے اندر سے غائب بھی ہو جائے تو جب کبھی بھی اس کو دنیا پر ظاہر ہونا ہے ہمارے ہی واسطہ سے ظاہر ہونا ہوگا۔ اس غرور کے ساتھ ظاہر ہے کہ کسی ایسے حق کو قبول کرنا ان لوگوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے جس کے داعی وہ خود نہ ہوں۔ چنانچہ دعوتِ حق کی پوری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جو لوگ اس مرض میں مبتلا رہتے ہیں ان کو حق پر ایمان لانے کی بہت کم ہی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ مکہ اور طائف کے وہ سردار جو کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر کوئی نبی بھیجنا ہی ہوتا تو وہ ہمارے اندر سے کسی کو بھیجتا، اسی بیماری میں مبتلا تھے۔ یہی لوگ تھے جو اسلام کے حق اور اس کے ایک نعمتِ الٰہی ہونے کے اس بنا پر منکر تھے کہ اگر یہ حق اور اللہ کا اتارا ہوا دین ہوتا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم سے پہلے یہ بد ذلیل اور فاقہ مست لوگ اس کو پالتے! انہی لوگوں کے ساتھ یہود بھی شریک تھے جن کی اسلام کے ساتھ ساری عداوت و مخالفت